وزیراعظم پاکستان جناب محمد شہباز شریف ملائیشیا کے وزیراعظم جناب انور ابراہیم سے مصافحہ کرتے ہوئے

اداریہ

نومبر کا مہینہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی پیدائش کا مہینہ ہے۔علامہ اقبالؒ کی شاعری میں مسلمانوں میں بیداری کی لہر اور اُمتِ مسلمہ کی رہنمائی نمایاں نظر آتی ہے۔عشق، عقل اور خودی، کلامِ اقبال کی روح ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

علامہ اقبالؒ کے کلام کا مقصد مسلمانوں کو ہر طرح کے قومی اور نسلی تعصّبات سے کنارہ کش کر کے واحد، منظّم اور مستحکم ملتِ اسلامی کا جزو بننے کی تلقین کرنا ہے۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی

کلامِ اقبال میں اِن کے نمایاں اور روشن پہلو اِن کے پیغامات ہیں جو آپ وقتاً فوقتاً نوجوانوں کو دیتے رہے ہیں۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

نومبر پاکستان کے معروف شاعر فیض احمد فیضؔ کی وفات کا مہینہ ہے۔فیض احمد فیضؔ نے اپنے عصر کے درد، کرب، سماج کے مسائل اور عوام کی دھڑکنوں میں بسے احساس کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔انہیں اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔

پاکستان۔۔۔ ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکن ہے اور ہر دل اِس پر نثار ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت اِس کی بہتری اور خوشحالی کے لیے دن رات کام میں مصروفِ عمل ہے۔گزشتہ ماہ 14 اکتوبر کو پاکستان اور چین کے وزرائے اعظم نے گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا ورچوئل افتتاح کیا۔وزیرِاعظم جناب محمد شہباز شریف کا کہنا تھا کہ گوادر ایئرپورٹ سی پیک کے گلدستے میں ایک اور پھول کا اضافہ ہے۔ 17-16 اکتوبر کو پاکستان میں شنگھائی تعاون تنظیم کے تئیسویں اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ایس سی او سربراہی اجلاس کے مشترکہ اعلامیہ میں ''**ایک دنیا، ایک خاندان اور ایک مستقبل**'' کے فلسفے پر زور دیا گیا۔

اُمید ہے کہ ایس سی او کانفرنس کا کامیاب انعقاد پاکستان کو عالمی برادری میں نا صرف ایک ممتاز مقام دے گا بلکہ پاکستان کی معاشی ترقی کیلئے نئے دروازے کھولے گا۔

انشاءاللہ

سرپرستِ اعلیٰ
عنبرین جان
نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ
نگران
راحیلہ تسنیم
فخر عباس
مدیرِ اعلیٰ
افشاں نگار
مدیرہ
میمونہ شمیل
معاونت
امان اللہ سپرا
عاقل خان
محمد انعام الحق
کمپوزنگ
رابعہ شبیر احمد
قیمت -/500 روپے

فہرست نومبر 2024ء

☆عزمِ نو۔۔۔۔

3 پاکستان میں شنگھائی تعاون تنظیم کا تئیسواں اجلاس — رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف
وزیرِاعظم جناب محمد شہباز شریف کا شنگھائی تعاون تنظیم کے 23ویں اجلاس سے
5 خطاب — رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف
وزیرِاعظم جناب محمد شہباز شریف کی مندوبین سے دوطرفہ ملاقاتیں
6 رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف
9 چینی وزیرِاعظم جناب لی چیانگ کا 4 روزہ دورۂ پاکستان — رپورٹ: افشاں نگار
10 گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا ورچوئل افتتاح — رپورٹ: افشاں نگار
شنگھائی تنظیم ایس سی او کے کامیاب انعقاد پر وفاقی وزیر برائے اطلاعات ونشریات
11 جناب عطا تارڑ کی میڈیا سے خصوصی گفتگو
12 26ویں آئینی ترمیم کی توثیق — رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف

☆قابلِ تقلید۔۔۔۔

13 ظفر علی خان — ناصر علی خان
14 مرزا ابوالحسن اصفہانی — رابعہ شبیر احمد

☆علم ودانش۔۔۔۔

15 علامہ اقبالؒ معاصرین کی نظر میں — عمران منور اعوان
17 فیض احمد فیضؔ — افشاں نگار
19 شبلی نعمانی — تحریر وتحقیق: سبین حیات

☆آہنگِ صوفیانہ۔۔۔۔

21 'بھیتا'— ہندوستانیوں کے ہاں نفرت کا ایک استعارہ
(محمد سعید احمد شیخ)

☆اُردو ادب۔۔۔۔

24 ''نوجوان ورتھر کی داستانِ غم'' عالمی ادب کے تراجم سے خصوصی تحریر

☆اندازِ سُخن۔۔۔۔

26 (غزلیات) جون ایلیاء
تنویر نقوی — اعزاز احمد آذر

☆سائنس اور ٹیکنالوجی۔۔۔۔

28 آکوپنکچر (سائنس برائے امن وترقی کا عالمی دن) — عفاف شیخ

☆صدائے عالم۔۔۔۔

29 عالمی یومِ برداشت — سبین حیات
30 سونامی سے آگاہی کا عالمی دن — جعفر بلوچ
31 ایک لڑکی (عالمی یومِ اطفال) — مرزا ادیب
33 ذیابیطس کا عالمی دن
34 (طلباء وطالبات کا عالمی دن) سروے آج کا طالبعلم اور سوشل میڈیا کا چیلنج
میمونہ شمیل

☆سیاحت۔۔۔۔

36 موضع بلی ٹنگ — احمد پراچہ

☆ہم تو آواز ہیں۔۔۔۔

37 ریڈیو پاکستان ملتان کی سالگرہ — نسرین فرید
39 پاکستان کے بیورو آف سٹیٹسٹک کے زیرِاہتمام ڈیٹا فیسٹ 2024 کا انعقاد
رپورٹ: اُجالا خورشید

☆فن اور فنکار۔۔۔۔

آہنگ ڈیسک
40 اسلم پرویز

پاکستان میں شنگھائی تعاون تنظیم کا تئیسواں (23واں) اجلاس

رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف

شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہی اجلاس کے لیے معزز بین الاقوامی مہمانوں کے استقبال کے لیے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ اسلام آباد کی سڑکوں اور پُلوں کو روشن سجاوٹ کے ساتھ جگمگایا گیا۔ شہر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ حفاظتی اقدامات اور سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے گئے۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی ہدایت کے مطابق فوج سمیت قانون نافذ کرنے والے اداروں نے سیکیورٹی کے فول پروف اقدامات کیے۔ حکومت نے اسلام آباد میں تین روزہ عام تعطیل کا اعلان کیا اور شہر میں پولیس اور نیم فوجی دستوں کی بھاری نفری تعینات رہی۔

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کی اہم شاہراہوں، گرین بیلٹس اور عمارتوں کو برقی قمقموں سے سجایا گیا۔ پُلوں کے نیچے رنگ برنگی ڈرائینگز بنائی گئیں۔ ریڈ زون اور ایئر پورٹ کی شاہراہوں پر معزز مہمانوں کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ یہ تزئین و آرائش شنگھائی تعاون تنظیم کے 23ویں اجلاس میں شرکاء کے پُرتپاک استقبال کے لیے تھیں۔

شنگھائی تعاون تنظیم کا 23واں اجلاس 15 اور 16 اکتوبر کو منعقد ہوا جس میں پاکستانی دفتر خارجہ کے مطابق چین، روس، بیلاروس، قازقستان، کرغزستان، تاجکستان اور ازبکستان کے وزرائے اعظم کے علاوہ ایران کے نائب صدر اور بھارت کے وزیر خارجہ نے شرکت کی۔ اِس تقریب میں شنگھائی تعاون تنظیم کے رکن ممالک کے رہنماؤں جن میں چین کی سٹیٹ کونسل کے وزیراعظم لی چیانگ Li Qiang، بیلاروس کے وزیراعظم رومان گولوف چینکو Roman Golovchenko، قازقستان کے وزیراعظم اولژاس بیک تیتوف Olzhas Bektenov، روس کے وزیراعظم میخائل مشوستن Mikhail Mishustin، تاجکستان کے وزیراعظم کوہر رسول زادہ Kohir Rasulzoda، ازبکستان کے وزیراعظم وزیرعبداللہ اریپوف Abdulla Aripov، کرغزستان کے وزرائے کابینہ کے چیئرمین ژاپاروف اکیل بیک Zhaparov Akylbek اور بھارتی وزیر خارجہ سبرا منیم

جیشنکر Subrahmanyam Jaishankar نے شرکت کی۔ اِس کے علاوہ منگولیا نے ایک مبصر ریاست کے طور پر سربراہی اجلاس میں شرکت کی جس کی نمائندگی وزیراعظم اویون اردین لویسنا مسرای Oyun-Erdene Luvsannamsrai نے کی اور ترکمانستان کے وزراء کی کابینہ کے نائب چیئرمین راشد میریدوف Rashid Meredov شریک ہوئے۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے دیگر معززین میں ایس سی او کے سیکرٹری جنرل جانگ منگ Zhang Ming، ڈائریکٹر ایگزیکٹو کمیٹی ایس سی او رجنل اینٹی ٹیررسٹ سٹرکچر رسلان مرزائیف Ruslan Mirzayev بورڈ آف ایس سی او بزنس کونسل کے چیئرمین عاطف اکرام شیخ Atif Ikram Shaikh اور کونسل آف ایس سی او انٹربینک یونین کے چیئرمین مارات یلی بائیف Marat Yelibayef شامل تھے۔

ایس سی او سربراہی اجلاس کے مشترکہ اعلامیہ میں **"ایک دنیا، ایک خاندان اور ایک مستقبل"** کے فلسفے پر زور دیا گیا۔ اِس اعلامیہ کے مطابق وفود کے سربراہان اور تنظیم کے رکن ممالک خطے میں وسیع، کھلی، باہمی طور پر فائدہ مند اور مساوی تعامل کی جگہ بنانے کے لیے خطے کے ممالک بین الاقوامی تنظیموں اور کثیر الجہتی انجمنوں کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا اہم سمجھتے ہیں۔

اعلامیہ میں کہا گیا کہ ایس سی او اجلاس میں شامل ہونے والے وفود اور رکن ممالک بین الاقوامی قانون کے اصول، باہمی احترام اور قومی مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔

مشترکہ اعلامیہ کے مطابق سبز ترقی، ڈیجیٹل معیشت اور تجارت جیسے شعبوں میں خطے کی صلاحیت کو بہتر بناتے ہوئے رکن ممالک کی پائیدار اور جامع اقتصادی ترقی کو آگے بڑھانے کو اہم سمجھا گیا اور ای کامرس، فنانس اور بینکنگ، سرمایہ کاری، اعلیٰ ٹیکنالوجی، سٹارٹ اپس اور احتراع، غربت کے خاتمے، صحت کی دیکھ بھال، بشمول روایتی اور جدید ادویات، زراعت، صنعت، ٹرانسپورٹ اور لاجسٹکس کنیکٹیوٹی، توانائی بشمول قابل تجدید توانائی، مواصلات، سائنس اور ٹیکنالوجی، ماحولیات، موسمیاتی تبدیلی، انفارمیشن سیکیورٹی میں تعاون بڑھانے پر زور دیا گیا۔

اعلامیہ میں بتایا گیا کہ سربراہان نے الیکٹرانک تجارت کے سپیشل ورکنگ گروپ کے مسلسل اجلاس منعقد کرنے کی ضرورت پر زور دینے کے علاوہ قومی صنعتی پالیسی اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے تجربات کے تبادلے کی تجویز کا بھی جائزہ لیا۔

اِس کے علاوہ سربراہان نے پروڈکشن ٹیکنالوجی اور آئی ٹی سے متعلق اقدامات پر عملدرآمد کے تجربات کی تجویز کا بھی جائزہ لیا۔

اعلامیے کے مطابق اجلاس میں پاکستان، کرغزستان، بیلاروس، قازقستان، روس اور ازبکستان نے چین کے بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو کی حمایت کی اور تنظیم کے یورپ اور ایشیا کے مابین بہتر اقتصادی اشتراک کی ضرورت پر زور دیا۔

اجلاس نے گرین ڈیولپمنٹ، ڈیجیٹل اکانومی، تجارت، سرمایہ کاری، ٹیکنالوجی کے شعبوں میں رکن ممالک کے استعدادِ کار بڑھانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

اعلامیے میں بتایا گیا کہ سربراہان نے ایس سی او کے سربراہان حکومت کے کامیاب اجلاس پر پاکستان کو خراج تحسین پیش کیا۔

نیوز اینڈ کرنٹ افیئرز چینل

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا شنگھائی تعاون تنظیم کے 23ویں اجلاس سے خطاب

رپورٹ: چوہدری ضمیر اشرف

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہان حکومت کے 23ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے خوشحال مستقبل کے لیے راوبط بڑھانے، غربت کے خاتمے، موسمیاتی اثرات سے نمٹنے کے اقدام اور وسیع تر کاروباری تعاون کے حوالے سے شنگھائی تعاون تنظیم کے رکن ملکوں کے درمیان تیز تر روابط کے لائحہ عمل کے قیام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ علاقائی تجارت بلکہ باہمی طور پر جڑے ہوئے یورپ اور ایشیاء کے ویژن کو بھی فروغ دیگا۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک خطہ ایک شاہراہ اقدام اور بین الاقوامی شمالی جنوبی نقل وحمل کی راہداری جیسے منصوبوں کو توسیع دینی چاہیے جس میں سڑک، ریل اور ڈیجیٹل بنیادی ڈھانچے کو ترقی دی جائے۔ وزیراعظم نے کہا کہ پاکستان توانائی تعاون 2030 کی ترقی اور سرمایہ کاروں کی ایسوسی ایشن کے قیام کو یقینی بنانے اور اِس کی توثیق کے فیصلوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان بلند عزائم کی تکمیل کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

وزیراعظم پاکستان جناب محمد شہباز شریف نے مستحکم افغانستان کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہ وسیع مواقع کے مکمل ادراک کیلئے نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ اُنہوں نے افغان عبوری حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ اِس بات کو یقینی بنائے کہ اُن کی سرزمین کسی بھی گروہ کی جانب سے اِس کے پڑوسیوں کے خلاف دہشت گردی کے لیے استعمال نہ ہو۔

وزیراعظم شہباز شریف نے غربت کی بنیادی وجوہات سے نمٹنے اور خطے کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے اجتماعی کوششوں پر زور دیا اور موسمیاتی تبدیلی کو بحران قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان موسمیاتی آفات سے سب سے زیادہ متاثر ہو رہا ہے۔ انہوں نے شنگھائی تعاون تنظیم کے اندر ماحولیاتی تعاون کو ترجیح دینے پر زور دیا تاکہ استقامت پیدا ہو اور آنے والی نسلوں کے لیے پائیدار مستقبل کو محفوظ بنایا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان ماحولیاتی تحفظ کے بارے میں حالیہ شنگھائی تعاون تنظیم کے معاہدے کا خیر مقدم کرتا ہے اور تمام رکن ملکوں سے علاقائی اور عالمی ماحولیاتی کوششوں میں فعال کردار ادا کرنے پر زور دیتا ہے۔ مزید کہا کہ پاکستان اس بات کا خواہاں ہے کہ شنگھائی تعاون تنظیم کے شراکت دار بھی اسی طرح کے اجلاسوں کا انعقاد کریں تاکہ پورے خطے میں آفات سے نمٹنے کی تیاریوں کو تقویت دی جا سکے۔ شہباز شریف نے مالیاتی چیلنجز کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ترقی کو فروغ دینے کے لیے عالمی مالیاتی ڈھانچے اور تجارتی نظام میں اصلاحات ناگزیر ہیں اور یہ کہ پاکستان شنگھائی تعاون تنظیم کے متبادل ترقیاتی فنڈ کے طریقہ کار کے قیام کی حمایت کرتا ہے جو تعطل کے شکار ترقیاتی منصوبوں کی بحالی کے لیے نئی جہت فراہم کر سکتا ہے۔

وزیراعظم نے ایس سی او کے رکن ملکوں پر زور دیا کہ وہ اپنے نجی شعبوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ایسا ماحول پیدا کریں جو شنگھائی تعاون تنظیم کے خطے میں کاروبار اور سرمایہ کاری کے لیے سازگار ہو۔ رکن ملکوں کی باہمی کرنسیوں میں تجارت کے لئے بڑھتا ہوا اتفاق ایک مثبت پیش رفت ہے۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ پاکستان اِس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ خطے میں پائیدار ترقی کے حصول کے لیے ایک مضبوط اور موثر ایس سی او ناگزیر ہے۔ مزید یہ کہ پاکستان عوام کے درمیان تعلقات کے قیام، ثقافتی تبادلوں اختلافات کے خاتمے، ہم آہنگی اور افہام وتفہیم کو فروغ دینے اور تعاون کو مستحکم کرنے کیلئے پرعزم ہے۔

اِس سے قبل وزیراعظم نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا کہ یہ اجلاس مختلف اقوام کے درمیان ہمارے مضبوط اور مستحکم تعلقات اور تعاون کا ایک اور ثبوت ہے۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے روس کو مبارکباد دیتے ہوئے انہیں شنگھائی تعاون تنظیم کے آئندہ اجلاس کی صدارت کیلئے پاکستان کے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ شنگھائی تعاون تنظیم کو کامیاب قرار دیتے ہوئے وزیراعظم نے کہا کہ اِس سے آئندہ نسلوں کے بہتر اور پائیدار مستقبل کے ہمارے مشترکہ عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ اُنہوں نے ایس سی او کے مشترکہ اہداف اور مقاصد کے لئے پاکستان کے غیر متزلزل عزم کا اعادہ کیا۔

غزہ میں فلسطینیوں کی جاری نسل کُشی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے وزیراعظم شہباز شریف نے کہا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور بین الاقوامی برادری کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غزہ میں غیر مشروط اور فوری جنگ بندی کو یقینی بنائے۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے ایس سی او رہنماؤں اور اُن کے وفود کے اعزاز میں استقبالیہ بھی دیا۔

شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) وزیراعظم شہباز شریف کی مندوبین سے دوطرفہ ملاقاتیں

چوہدری ضمیر اشرف

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف سے شنگھائی تعاون تنظیم سربراہانِ حکومت کے 23ویں اجلاس کے موقع پر جمہوریہ روس کے وزیراعظم مسٹر میخائل مشوستن کی وزیرِاعظم ہاوس میں ملاقات ہوئی۔

دونوں وزرائے اعظم نے دوطرفہ تعاون کے تمام شعبوں پر تبادلہ خیال کیا اور گزشتہ دو دہائیوں کے دوران پاکستان اور روس کے مابین تعلقات کی مثبت سمت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے تجارت، صنعت، توانائی، علاقائی روابط، سائنس، ٹیکنالوجی اور تعلیم کے شعبوں میں مضبوط بات چیت اور تعاون کو فروغ دینے پر اتفاق کیا۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے روس کے ساتھ دوطرفہ سیاسی، اقتصادی اور دفاعی مذاکرات کو تیز کرنے کی پاکستان کی خواہش کا اعادہ کیا۔ دونوں رہنماؤں نے اقوامِ متحدہ اور شنگھائی تعاون تنظیم سمیت کثیرالجہتی فورمز پر تعاون جاری رکھنے پر بھی اتفاق کیا۔ وزیرِاعظم محمد شہباز شریف نے برکس میں پاکستان کیلئے تعاون پر روسی وزیرِاعظم کا شکریہ ادا کیا۔

وزیراعظم نے پاکستان اور روس کے مابین مواصلاتی روابط کے فروغ کیلئے براہ راست پروازوں کی اہمیت پر زور دیا ۔ روسی وزیراعظم نے شنگھائی تعاون تنظیم کے 23ویں سربراہانِ حکومت اجلاس کیلئے پاکستان کی جانب سے کئے گئے شاندار انتظامات کی تعریف کی۔ اُنہوں نے پاکستان کی حکومت اور پاکستانی عوام کی جانب سے روسی وفد کے پُرتپاک استقبال اور شاندار مہمان نوازی پر شکریہ ادا کیا۔ اُنہوں نے ملاقات میں روس پاکستان تعاون کو مزید فروغ دے کر نئی بلندیوں پر پہنچانے کی اپنی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ ملاقات میں دونوں وزرائے اعظم نے باہمی دلچسپی کے تمام شعبوں پر تعاون کو مزید فروغ دینے پر اتفاق کیا۔ دونوں رہنماؤں نے عوامی روابط کے فروغ کیلئے روسی اور اُردو زبان کے تدریسی تبادلوں اور سرمایہ کاری وتجارت کی سہولت کیلئے بینکنگ شعبے میں تعاون کے فروغ پر بھی اتفاق کیا۔

وزیراعظم جناب شہباز شریف نے اپنے **تاجک ہم منصب کو ہر رسول زادہ** سے دوطرفہ ملاقات کی انہوں نے باہمی دلچسپی کے دوطرفہ امور پر تبادلہ خیال کیا۔

بیلاروس کے وزیراعظم رومان گولوف چینکو کے ساتھ اپنی ملاقات میں وزیراعظم شہباز شریف نے دوطرفہ تعاون کو بروئے کار لانے کی ضرورت پر زور دیا۔

وزیراعظم شہباز شریف نے **کرغزستان کی وزراء کی کابینہ کے چیئرمین ژاپاروف اکیل بیک** سے بھی ملاقات کی اور شنگھائی تعاون تنظیم کے اجلاس میں جمہوریہ کرغزستان کی شرکت کا شکریہ ادا کیا۔

ترکمانستان کی وزراء کی کابینہ کے ڈپٹی چیئرمین اور وزیر خارجہ راشد میر یدوف نے بھی وزیراعظم شہباز شریف سے ملاقات کی اور دوطرفہ دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ وزیراعظم جناب شہباز شریف نے خاص طور پر تجارت، توانائی اور علاقائی رابطوں کے شعبوں میں دوطرفہ تعاون کو فروغ دینے کے لئے مل کر کام کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

قازقستان کے وزیراعظم اولژاس بیک تینوف سے ملاقات میں وزیراعظم شہباز شریف نے تجارت اور زراعت پر مشترکہ ورکنگ گروپس کے اجلاس جلد بلانے پر زور دیا۔

پاک کرغزستان

وزیر برائے اقتصادی اموراحد چیمہ نے **کرغزستان کے وزیرِخزانہ دانیار امنگیلدیف** کی قیادت میں آئے وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ یہ دوطرفہ ملاقات سودمند ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان اور کرغزستان کے درمیان پائیدار دوستی اور شراکت داری کو مزید تقویت بخشے گی۔ اُنہوں نے اسلام آباد میں شنگھائی تعاون تنظیم کے اجلاس میں شرکت پر کرغزستان کے وفد کا شکریہ ادا کیا۔ گفتگو کے دوران اِس بات پر اتفاق کیا گیا کہ دونوں ممالک کے درمیان تجارت میں اضافے کے لئے گنجائش موجود ہے جس کا حجم فی الحال 8.63 ملین ڈالر ہے۔ 2022-23 میں کرغزستان کو پاکستان کی برآمدات 3.33 ملین امریکی ڈالر اور درآمدات 5.3 ملین امریکی ڈالر تھیں۔ احد چیمہ نے کہا کہ اِن اعداد وشمار کو بڑھانے اور موجودہ تجارتی عدم توازن کو دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اِس کے علاوہ باہمی تعاون کے مختلف شعبوں پر تبادلۂ خیال کیا گیا جن میں تجارت، زراعت، توانائی، کان کنی، ڈیجیٹل ڈویلپمنٹ، سیاحت، صحت، بینکنگ اور تعلیم شامل ہیں۔ وفاقی وزیر احد چیمہ نے زراعت اور تجارت جیسے اہم شعبوں میں تعاون کو فروغ دینے کے لیے مشترکہ ورکنگ گروپس کے اجلاس بلانے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔

اجلاس میں زراعت اور تجارت میں تعاون کے لیے ٹرانزٹ ٹریڈ اگریمنٹ اور مفاہمت کی متعلقہ یادداشتوں کو حتمی شکل دینے پر بھی غور وخوض کیا گیا۔

بعدازاں وزیراعظم جناب شہباز شریف نے اسلام آباد میں شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہان حکومت اور اُن کے وفود کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی مندوبین سے ملاقاتوں کی تصویری جھلکیاں

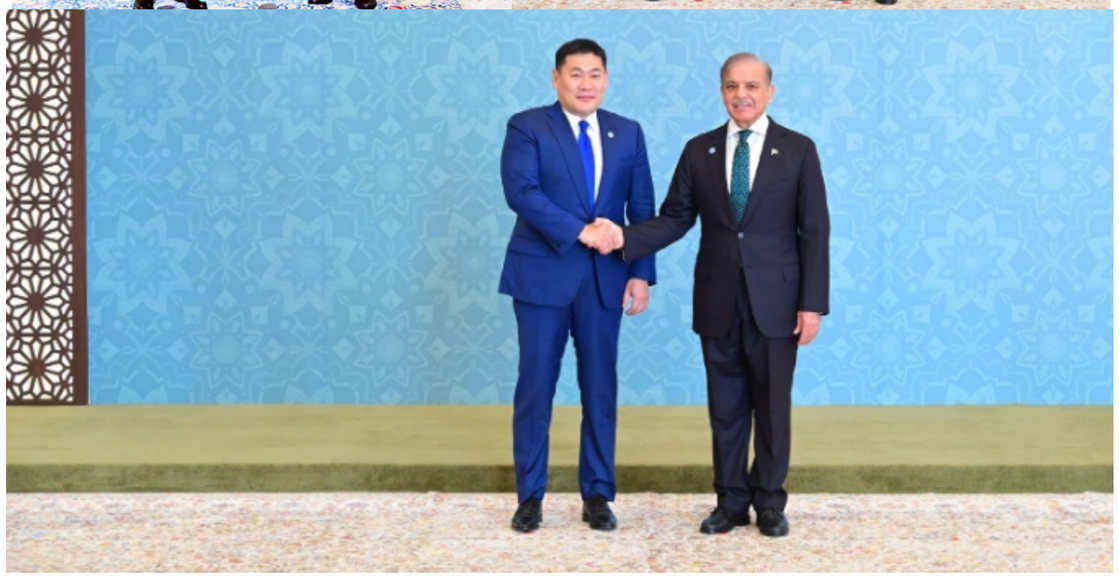

چینی وزیراعظم جناب لی چیانگ کا 4 روزہ دورۂ پاکستان

رپورٹ: افشاں نگار

چینی وزیراعظم لی چیانگ 14 اکتوبر کو چار روزہ سرکاری دورے پر وفد کے ہمراہ ایئر چائنا کے طیارے میں نور خان ایئربیس پر پہنچے جہاں وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے اُن کا بھرپور استقبال کیا۔ بچوں نے خوبصورت گلدستے پیش کئے۔ چینی وزیراعظم لی چیانگ کے استقبال پر توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔ بعدازاں چینی وزیراعظم لی چیانگ وزیراعظم ہاؤس پہنچے جہاں دونوں ممالک کے قومی ترانوں کی دُھنیں بجائی گئیں۔ مُسلح افواج کے دستوں نے مہمان کو گارڈ آف آنر دیا۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے اپنے چینی ہم منصب کے اعزاز میں ظہرانے کا بھی اہتمام کیا۔

چین پاکستان کے بہترین اور نہایت مخلص دوست ممالک میں سے ایک ہے جس نے ہر حال میں پاک چین دوستی کو برقرار رکھا ہے۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ چینی وزیراعظم لی چیانگ کا یہ دورۂ دوستی اِس رشتے کو مزید آگے بڑھانے کا سبب بنے گا۔ دونوں ملکوں میں مختلف شعبوں میں مفاہمتی یادداشتوں اور دستاویزات کے تبادلے سے چین کے ساتھ انفارمیشن ،مواصلات ،سمارٹ کلاس رومز پروجیکٹ ،چین کو گوشت کی برآمد کے سلسلے میں مشترکہ لیبارٹری اور آبی تحفظ کے شعبے میں مفاہمت پاکستان کی معاشی ترقی میں قابلِ ذکر اضافہ کر سکتی ہے۔

چینی وزیراعظم لی چیانگ پاکستان کے دورے اور ایس سی او سربراہی اجلاس میں شرکت کے بعد روانہ ہوگئے۔ نور خان ایئربیس پر وفاقی وزیر منصوبہ بندی وترقی جناب احسن اقبال نے انہیں الوداع کیا۔ جناب احسن اقبال نے اِس موقع پر چینی وزیراعظم کو دوبارہ پاکستان آنے کی بھی دعوت دی۔ اُنہوں نے سی پیک کو پاک چین دوستی کا ایک سنگِ میل قرار دیا جو دیوارِ چین کی طرح مضبوط ہے۔ چینی وزیراعظم جناب لی چیانگ نے سی پیک کے لیے وفاقی وزیر احسن اقبال کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ پاکستان چین کا فولادی بھائی ہے اور وہ دوبارہ پاکستان آئیں گے۔ وزیراعظم جناب لی چیانگ نے پاکستان کے عوام اور وزیراعظم پاکستان جناب شہباز شریف کی شاندار میزبانی کا شکریہ ادا کیا۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف اور چینی وزیراعظم لی چیانگ کے درمیان مفاہمتی یادداشتوں پر دستخط کئے گئے۔ ملاقات میں دونوں ممالک کے درمیان سی پیک ورکنگ گروپ، اسمارٹ کلاسز روم، گوادر پر ساتویں جوائنٹ ورکنگ گروپ، انسانی وسائل کی ترقی، اطلاعات اور مواصلات، آبی وسائل، غذائی تحفظ کے شعبہ، مشترکہ لیبارٹریوں کے قیام، ٹیلی ویژن پروگرامز کی مشترکہ پروڈکشن، کرنسی کے تبادلے اور سلامتی کے شعبے سمیت 13 شعبہ جات میں ایم او یوز سائن کیے گئے اور وزراء و سیکریٹریز نے دستاویزات کا تبادلہ کیا۔ چینی وزیراعظم کے دورۂ پاکستان پر ترجمان چینی وزارتِ خارجہ کا کہنا ہے کہ وزیراعظم جناب لی چیانگ کا دورۂ پاک چین تعلقات کو مزید مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ترجمان چینی وزارتِ خارجہ کا کہنا تھا کہ چین اور پاکستان آہنی دوست ہیں اور تمام موسموں کے تزویراتی تعاون کے شراکت دار ہیں۔ دونوں ممالک کے تعلقات آزمائشوں کا مقابلہ کر کے چٹان کی طرح مضبوط ہیں۔ ترجمان چینی وزارتِ خارجہ کا مزید کہنا تھا کہ چین پاکستان کے تعلقات ترقی کی اعلیٰ سطح پر بہتر رفتار کا مظہر ہیں۔ دونوں ممالک علاقائی امن و استحکام، ترقی اور خوشحالی برقرار رکھنے کے لئے مل کر کام کرتے رہیں گے۔

گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا ورچوئل افتتاح

پاکستان اور چین کے وزرائے اعظم نے گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا ورچوئل افتتاح کر دیا

رپورٹ: افشاں نگار

پاکستان اور چین کے وزرائے اعظم نے گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا ورچوئل افتتاح کر دیا۔ چینی وزیراعظم لی چیانگ کا کہنا تھا کہ منصوبے کی تکمیل کے لیے پاکستان اور چین کی افرادی قوت کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔ گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی تکمیل اہم سنگِ میل ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ گوادر علاقائی ترقی کا محور ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کی مضبوط دوستی کا بھی عکاس ہے۔ پاکستان کی ترقی کے لیے چین اپنا کردار ادا کرتا رہیگا۔ پاکستان کے عوام کی خوشحالی ہمارے دل کے بہت قریب ہے۔ دونوں ملکوں کی تذویراتی شراکت داری وقت کے ساتھ گہری ہو رہی ہے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ پاکستان اور چین نے صنعت، زراعت، تجارت کے شعبے میں متعدد مفاہمتی یادداشتوں کا تبادلہ کیا ہے۔ دوطرفہ معاہدے دونوں دوست ملکوں کے درمیان نئے باب کا اضافہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی ترقی کیلئے چین کے پختہ عزم کے معترف ہیں۔ معاشی ترقی کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں چین نے نمایاں کردار ادا کیا۔ گوادر انٹرنیشنل ایئرپورٹ دونوں ملکوں کی مضبوط دوستی کا مظہر ہے اور یہ ترقی کی جانب ایک بڑا قدم ہے۔ گوادر کو عالمی اور علاقائی سطح کی بندرگاہ اور کاروباری مرکز کے طور پر ترقی دینے کے لیے انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی اہمیت واضح ہے اور شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہی اجلاس کی مناسبت سے یہ پیشرفت مزید اہمیت اختیار کر جاتی ہے کیونکہ گوادر کو علاقائی تجارت کے مرکز کے طور پر ڈویلپ کیا گیا ہے اور یہ وسط ایشیا کی خشکی سے گھری ریاستوں کو بین الاقوامی بحری تجارت سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ علاقائی تعاون اور مشترکہ ترقی کا مقصد حاصل کرنے کیلئے جنوبی ایشیا اور وسط ایشیا میں زمینی رابطے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ تیز رفتار عالمی تبدیلیوں کے نتیجے میں وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا ایک ایسے نازک موڑ پر ہیں جہاں انہیں اپنی بین الاقوامی تجارتی صورتحال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وسطی اور جنوبی ایشیا کے درمیان تجارت اور سرمایہ کاری میں اضافے کی نمایاں صلاحیت کے باوجود فی الحال ان خطوں میں اقتصادی روابط کا فقدان ہے۔ اسے بڑھانے کیلئے زمینی روابط کا ترقی یافتہ نظام ناگزیر ہے۔ وزیراعظم جناب شہباز شریف کا کہنا تھا کہ گوادر ایئرپورٹ سی پیک کے گلدستے میں ایک اور پھول کا اضافہ ہے۔ منصوبے کی تکمیل کے لیے دونوں ملکوں کے انجینئرز اور ورکرز کی کاوشوں کو سراہتے ہیں۔

شنگھائی تنظیم ایس سی او کے کامیاب انعقاد پر وفاقی وزیر برائے اطلاعات ونشریات

جناب عطا تارڑ

کی میڈیا سے خصوصی گفتگو

وزیر برائے اطلاعات ونشریات جناب عطا تارڑ نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں 27 سال بعد ایک بڑا اور اہم ایونٹ منعقد ہوا۔ وفاقی وزیر جناب عطا تارڑ نے شنگھائی تعاون تنظیم کے کامیاب انعقاد پر وزارتِ اطلاعات کے افسران اور پوری ٹیم کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ انفارمیشن گروپ کے افسران پر فخر ہے۔ وفاقی سیکرٹری برائے اطلاعات و نشریات محترمہ عنبرین جان اور پرنسپل انفارمیشن آفیسر مبشر حسن نے پرائم منسٹر آفس کی ٹیم کے ساتھ مل کر ایس سی او کانفرنس کی کامیابی کے لیے حیرت انگیز کام کیا۔ پاکستان چائنہ فرینڈ شپ سینٹر میں مقامی اور غیر ملکی صحافیوں کے لیے میڈیا فیسیلٹیشن سینٹر قائم کیا گیا اور شنگھائی تعاون تنظیم کے 23 ویں اجلاس میں شرکت کرنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے نغمہ جاری کیا۔ اِس نغمے میں پاکستان کے رنگا رنگ ثقافتی ورثے اور مہمان نوازی کی روایت کی ایک جھلک پیش کی گئی۔ نغمے میں پاکستان کے خوبصورت مقامات، تاریخی اور اہم عمارتیں اور متنوع ثقافت کو بڑی خوبصورت سے پیش کیا گیا۔ نغمے کے بول میں پاکستان کے لوگوں کی مہمان نوازی اور ایس سی او سربراہانِ مملکت کو خوش آمدید کہنے کا جذبہ موجزن تھا۔ اِس کے علاوہ پاکستان کی ترقی کے لیے پاکستان کی عوام کی محنت، لگن اور جذبے کو بھی بہت خوبصورتی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ نغمہ پاکستان کے نامور گلوکار عمیر جسوال نے گایا۔

وزارتِ اطلاعات ونشریات نے اُمید ظاہر کی ہے کہ یہ نغمہ مہمانوں کو پاکستان کی ثقافت سے روشناس کرائے گا اور اُن کے دلوں میں پاکستان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔ اُنہوں نے کہا کہ ایس سی او سربراہی کانفرنس کے کامیاب انعقاد سے پاکستان کا عالمی سطح پر تشخص بحال ہوا ہے۔ اِس کانفرنس سے عالمی رہنما اور مندوبین پاکستان سے اچھے تاثرات لے کر گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ کسی بھی ملک کی عوام اور اِس کے سافٹ امیج میں ثقافت کا ایک اہم کردار ہوتا ہے۔ ثقافتی تبادلوں کو آگے بڑھانا بہت ضروری ہے۔

وفاقی وزیر برائے اطلاعات ونشریات جناب عطا تارڑ نے اپنی گفتگو میں بتایا کہ ایس سی او سربراہی کانفرنس کی سائیڈ لائن پر دوطرفہ ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

وفاقی وزیر جناب عطا تارڑ نے آخر میں کہا کہ الحمدللہ! ایس سی او سربراہی کانفرنس کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی جس کے لیے انہوں نے کہا کہ یہ پارلیمنٹ حکومتِ پاکستان، وزارتِ خارجہ، وزارتِ اطلاعات، وزارتِ داخلہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں بشمول پولیس، رینجرز اور پاک فوج کے شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) سمٹ کے کامیاب انعقاد کے لیے اہم کردار کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ یہ پارلیمنٹ اِس کانفرنس کے موقع پر وفاقی دارالحکومت کو خوبصورتی سے سجانے، مہمانوں کو خیر مقدم کرنے اور پاکستان کے وقار کو بلند کرنے کے تمام حکومتی اداروں کی خدمات کو سراہتا ہے۔

26ویں آئینی ترمیم کی توثیق

چوہدری ضمیر اشرف

صدر آصف علی زرداری کے دستخط کے بعد 26ویں آئینی ترمیم کا گزٹ نوٹیفکیشن بھی جاری کر دیا گیا ہے۔ اِس سے قبل قومی اسمبلی کے اجلاس میں وزیرِ قانون اعظم نذیر تارڑ نے ترمیم پیش کرنے کی تحریک پیش کی۔ تحریک کی منظوری کے لیے 225 اراکینِ اسمبلی نے ووٹ دیے جبکہ 12 رکان نے مخالفت میں ووٹ دیا۔ قومی اسمبلی اجلاس شروع ہونے سے کچھ دیر قبل چیئر مین سینیٹ یوسف رضا گیلانی کی زیرِ صدارت سینیٹ کے اجلاس میں 26ویں آئینی ترمیمی بل 2 تہائی اکثریت سے منظور کرلیا گیا تھا۔ چیئر مین سینیٹ یوسف رضا گیلانی نے کہا تھا کہ سینیٹ کے 65 ارکان نے 26ویں آئینی ترمیمی بل کے حق میں ووٹ دیا جب کہ سینیٹ کے 4 ارکان نے مخالفت میں ووٹ دیا۔

بل کی منظوری کے بعد ایوان میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وزیر اعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ ملک میں لوگ انصاف کے لیے ترس رہے ہیں۔ آج ایک تاریخی دن ہے۔ قومی یکجہتی اور اتفاقِ رائے کی شاندار مثال ایک بار پھر قائم ہوئی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ آج آئین میں 26ویں ترمیم ہوئی ہے۔ حکومتوں کو گھر بھیجا جاتا تھا۔ وزرائے اعظم کو گھر بھیجا جاتا تھا۔ قومی یکجہتی اور اتفاق رائے کی شاندار مثال ایک بار پھر قائم ہوئی۔

اُن کا کہنا تھا کہ آج آئین میں 26ویں ترمیم ہوئی۔ ایک پانامہ تھا جو ختم ہوگیا۔ اقامہ پر سزا دی گئی۔ آج میثاقِ جمہوریت کا ادھورا خواب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ ماضی میں جو ہوا اب کسی وزیر اعظم کو گھر نہیں بھیجا جاسکے گا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ آئینی ترمیم بل کی منظوری پر تمام جماعتوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کاش پی ٹی آئی بھی اِس میں شامل ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔

بلاول بھٹو نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پی ٹی آئی اور جے یو آئی (ف) کے مطالبے پر آئینی عدالت چھوڑ کر آئینی بینچ بنانے جا رہے ہیں۔ افتخار چوہدری کی بلیک میلنگ میں 19 ویں ترمیم منظور کی گئی۔ آئینی عدالت کی سوچ آج کی نہیں بلکہ یہ بحث قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے شروع ہوئی۔ 2022ء میں عاصمہ جہانگیر کانفرنس میں بھی آئینی عدالت کی حمایت کی گئی۔ اُنہوں نے کہا کہ رضا ربانی نے اِسی کانفرنس میں کہا کہ آئینی عدالت نہیں تو آئینی بینچ دیا جائے۔ قائد اعظم کے دور سے جو سوچ چلی آرہی ہے ہم وہ آج پوری کرنے جا رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ایسی مثال نہیں کہ جج کو لگائے اور ہٹائے۔ کہتے ہیں پارلیمان کون ہوتا ہے، ہم عوام کے نمائندے ہیں۔ جب بینظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں، اُن سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ بینظیر بھٹو جج کی تعیناتی کرے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ اختیار وزیر اعظم سے چوری کر کے جیب میں رکھا، آئین کے ۔۔۔ نے مشرف کے دور میں حلف لیا۔

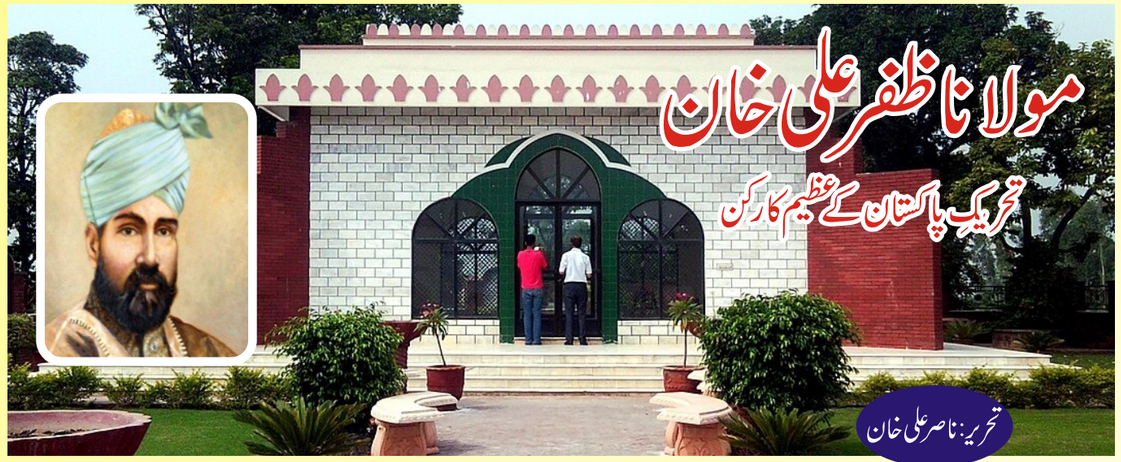

مولانا ظفر علی خان

تحریکِ پاکستان کے عظیم کارکن

تحریر: ناصر علی خان

مولانا ظفر علی خان ضلع سیالکوٹ کی ایک گاؤں میرٹھ کرم آباد میں 18 جنوری 1873ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم پٹیالہ اور وہاں سے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ جب مولانا ظفر علی خان علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے اُس وقت سرسید احمد خان زندہ تھے۔ ان کے گرد ایسے صاحب درو بزرگوں کا ہجوم تھا جو آگے چل کر ملت کی تقدیر کا ستارہ بننے والے تھے۔ ملت اسلامیہ کو ہندوستان میں تخت وتاج سے محروم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ سب کے سب لوگ مسلمانوں کی شکست دیکھ چکے تھے اور اس ابتلاء کے افسانے انہی لوگوں سے سن چکے تھے جو گرفتارِ بلارہ چکے تھے۔ انکی گود میں جو ایک جواں اور حوصلہ مند نسل پروان چڑھ رہی تھی، ظفر علی خان کو اُن میں ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ یہ وہ صورتحال تھی جب مولانا ظفر علی خان کی نسل کے لوگوں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ اُنہوں نے ایسے میں اپنے لیے صحافت کا میدان چُنا۔ اخبار ''زمیندار'' جو اُن کے والد جاری کر چکے تھے اس کی ادارت سنبھال لی اور ہر لحاظ سے اسے بہتر سے بہترین کرنے میں کوشاں ہوئے۔ ہزاروں صفحوں میں کوئی صفحہ اُن کی ندرتِ فکر سے خالی نہیں تھا۔ مقالات کی زبان میں ظفر علی خان کی شوکت اور دبدبہ، حکایات کی زبان میں چاشنی اور حلاوت، خبروں کی زبان میں حقیقت بیانی اور جاذبیت۔ شعر جو اَب تک محض شاعروں کی رونق بڑھاتا رہا تھا یا دربار میں مدح وستائش بن کے چمکتا رہا تھا اور جس میں حُسن وعشق کی واردات کے علاوہ کسی اور مضمون کا آنا بدعت شمار ہوتا تھا، اب سیاسی پلیٹ فارم پر آ گیا اور خالص سیاسی موضوع پر بھی اظہارِ خیال کا وسیلہ بنا۔ چنانچہ ایسی بلند پایہ نظمیں سیاسی واقعات اور سیاسی شخصیتوں پر آئیں جو باوجود اپنے ہنگامی نوعیت کے ادب کی جان ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کی خطابت، اُن کی صحافت اُن کی شاعری سے کم نہیں تھی۔ اسٹیج پر جب تشریف لاتے، فصاحت و بلاغت کا دریا بہہ نکلتا۔ تراکیبیں، استعارے، تشبیہیں، طنز و مزاح، برجستہ جملے اور حد تو یہ ہے کہ پوری کی پوری نظمیں وہیں کی وہیں جاری ہو جاتیں۔ اُن کی بے باکی بعض اوقات ہنگاموں تک کی صورت اختیار کر لیتی۔ مولانا ظفر علی خان کی سیاست مختلف ادوار سے گزری اور اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ اُن کی طبیعت کو کہیں قرار نہیں تھا۔ وہ ہر شخص کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھتے تھے کہ اگر انگریز دشمن ہیں تو وہ ان کا دوست ہے اور اگر کسی وقت کوئی شخص اس معیار پر پورا نہ اترا تو فوراً اس سے بگڑ جاتے۔ یہیں عادت کئی مرتبہ انہیں جیل لے گئی۔ اخبار کئی مرتبہ بند ہوا۔ کئی مرتبہ ان کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ پریس میں کئی بار سرکار نے قفل ڈالا۔ مالی حالت ہمیشہ خراب رہی لیکن وہ ہر درپیش آزمائش پر پورے اُترے۔ علامہ اقبالؔ نے درست کہا ہے کہ ''ظفر علی خان نے مسلمانوں کے دل سے انگریز کا خوف نکال دیا ہے اور سب بشری خامیوں کے باوجود ملتِ اسلامیہ نے جو ترکہ ان سے بے خوفی کا پایا، وہ ایک بے بہا نعمت تھی۔'' سرسید احمد خان جب منتشر و بدحال قوم کو اکٹھا کر رہے تھے تو ظفر علی خان اِس جدوجہد کے سپاہی تھے۔ جب قائداعظم محمد علی جناح قوم کو ایک نئے وطن میں لا رہے تھے تو ظفر علی خان قافلۂ سالاروں میں سے تھے۔

مولانا ظفر علی خان کی سیاست مختلف ادوار سے گزری لیکن اُن کا ہر دور نئی جدوجہدِ آزادی کیلئے راہیں ہموار کرتا رہا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے شانہ بشانہ ہر مشکل اور کٹھن راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کیلئے کوشاں رہے۔

مولانا ظفر علی خان معروف مصنف، شاعر اور صحافی تھے جو تحریکِ پاکستان کے اہم رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں اور آپ کو بابائے اُردو صحافت کہا جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان ایک سچے اور کھرے مسلمان، حکومتِ برطانیہ کے کٹر باغی، ایک سخت مزاج سیاسی لیڈر، شعلہ بیان خطیب اور انقلاب پسند ادیب، آزاد خیال، سخت گیر صحافی اور ایک ہمہ گیر شاعر تھے۔ تقریر ہو یا تحریر، نثر ہو یا نظم، اُن کی شاعری میں مذہبی جوش وخروش کی فراوانی ہے۔ تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ مذہبی موضوعات میں خاص طور پر نعتیہ شاعری میں اُن کے جوہر جس خلوص، شدت اور محبت سے کُھلے ہیں وہ انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کی نعت میں مولانا الطاف حسین حالؔی اور علامہ اقبالؔ کی ملی لہر ایک منفرد شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

وہ بخشوانے ہمیں آئیں گے قیامت میں
اگرچہ قابلِ بخشش نہیں ہمارے اعمال

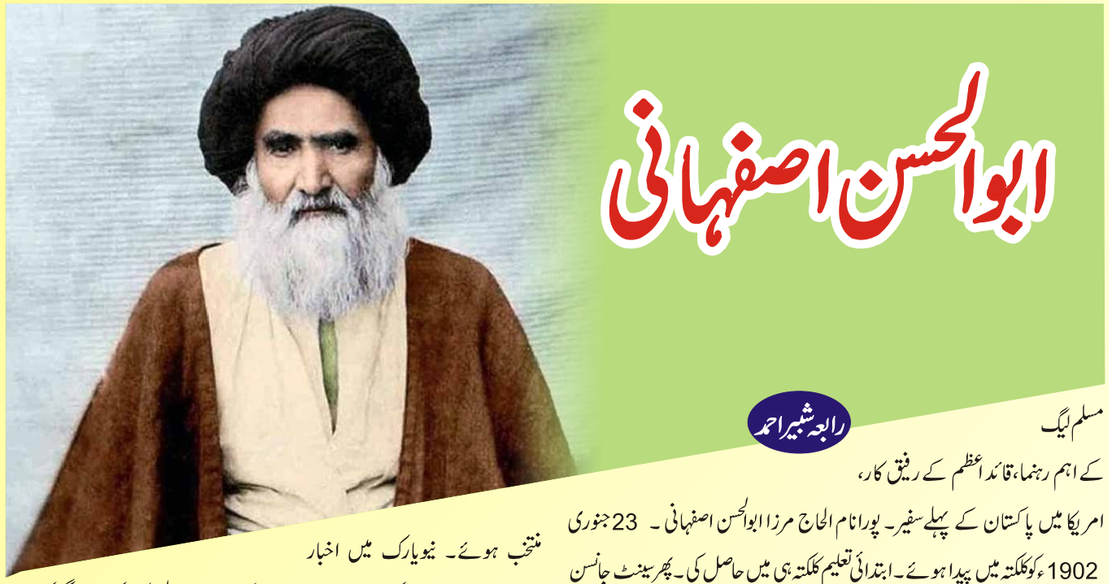

ابوالحسن اصفہانی

رابعہ شبیر احمد

مسلم لیگ کے اہم رہنما، قائداعظم کے رفیق کار، امریکا میں پاکستان کے پہلے سفیر۔ پورا نام الحاج مرزا ابوالحسن اصفہانی۔ 23 جنوری 1902ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ ہی میں حاصل کی۔ پھر سینٹ جانسن کالج، کیمبرج سے ایم اے ایل ایل بی اور 1924ء میں لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ 1925ء میں خاندانی کاروبار ''ایم ایم اصفہانی لمیٹڈ'' سے وابستہ ہو کر کچھ عرصے کے بعد ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ 1932ء میں کلکتہ کارپوریشن کے رکن منتخب ہوئے لیکن جلد ہی مستعفی ہو کر بلدیات میں جداگانہ انتخابات کی تحریک چلائی۔ 1940ء میں دوبارہ کارپوریشن کے رکن منتخب ہوئے۔ 1941ء اور 1942ء میں کارپوریشن کے ڈپٹی میئر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آپ نے قائداعظم کی پہلی تقریر کیمبرج کے دوران تعلیم سنی تھی اور اُسی وقت سے قائد کی شخصیت سے متاثر تھے۔ قائد سے پہلی ملاقات اگست 1920ء میں لندن ہی میں مرزا علی اصفہانی کے مکان پر ایک عشائیہ میں ہوئی۔ 1936ء میں قائداعظم کی دعوت پر پہلی بار مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی۔ 1937ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بنگال کی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1936ء تا 1947ء بنگال مسلم لیگ کے خازن اور قیامِ پاکستان تک آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل 1941ء مدراس میں مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی ترقی کے لئے پانچ سالہ منصوبہ مرتب کرنے کے لئے خصوصی کمیٹی بنائی گئی تھی، آپ اِس کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ انتیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل 1942ء الہ آباد میں اِس اَمر کی ایک قرارداد پیش کی کہ مسلم لیگ کی ترقی کے لئے قائداعظم کو مکمل اختیارات دے دیئے جائیں کہ وہ جیسا مناسب خیال کریں، مناسب اقدام کریں۔ یہ قرارداد صرف ایک مولانا حسرت موہانی کے اختلافی ووٹ کے سوا' اتفاقِ رائے سے منظور ہوگئی۔ 1946ء کے انتخابات میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اپریل 1946ء میں دہلی میں ہندوستان بھر کے مسلم لیگی منتخب ارکان اسمبلی کا جو کنونشن منعقد ہوا تھا، اُس میں بنگال کی سجکٹ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ نیویارک میں اخبار "ہیرلڈ ٹرے بیوان" کی جانب سے منعقدہ مذاکرے میں مسلم لیگ کی نمائندگی کی۔ 1946ء میں مسلم چیمبر آف کامرس کلکتہ کے صدر بھی رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد امریکا کے پہلے سفیر مقرر ہوئے (ستمبر 1947ء تا فروری 1952ء)۔ اِس دوران 1947ء میں اقوامِ متحدہ میں پاکستانی وفد کے ڈپٹی لیڈر نامزد ہوئے۔ اِسی سال ہوانا میں منعقدہ ٹریڈ کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ کشمیر کے مسئلے پر سیکیورٹی کونسل میں پاکستانی وفد کے نائب صدر تھے۔ 1952ء تا 1954ء برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہے۔ 1954ء اور 1955ء میں مرکزی حکومت میں وزیر صنعت وتجارت رہے۔ 1973ء اور 1974ء میں افغانستان میں پاکستان کے سفیر رہے۔ 1976ء تا 1979ء قائداعظم کی مجلسِ حاکمہ اور مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔ آپ نے پاکستانی موضوعات پر متعدد مضامین لکھے اور کتابیں تصنیف کیں جو انگریزی میں ہیں۔ آپ نے پاکستان موضوعات پر متعدد مضامین لکھے اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کے مضامین اور تصانیف میں اعلیٰ مقصد، اعلیٰ نصب العین اور فکری پختگی جیسے ذریں اصول جو خود اُن کی شخصیت کا خاصا بھی تھے، اُن کی جھلک آپ کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ انہی ذریں اصولوں نے آپ کو کامیاب سفارت کار بھی بنایا۔ اُن کی دُور اندیشی نے نئی مملکتِ پاکستان کو بیرونِ ممالک سے مزید قریب کیا۔ اگر آپ کی زندگی وفا کرتی تو آپ پاکستان کو بیرونی دنیا سے مزید متعارف کرواتے۔ ہمارے وطن پاکستان کو ہمیشہ ایسے مدبر، مخلص سیاست دان اور سیاسی اخلاقیات پر عمل پیرا رہنے والے ابوالحسن اصفہانی جیسے رہنماؤں کی ضرورت رہے گی۔ پاکستانی تاریخ ہمیشہ ایسے محبِ وطن کی مخلصانہ کوششوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی رہے گی۔

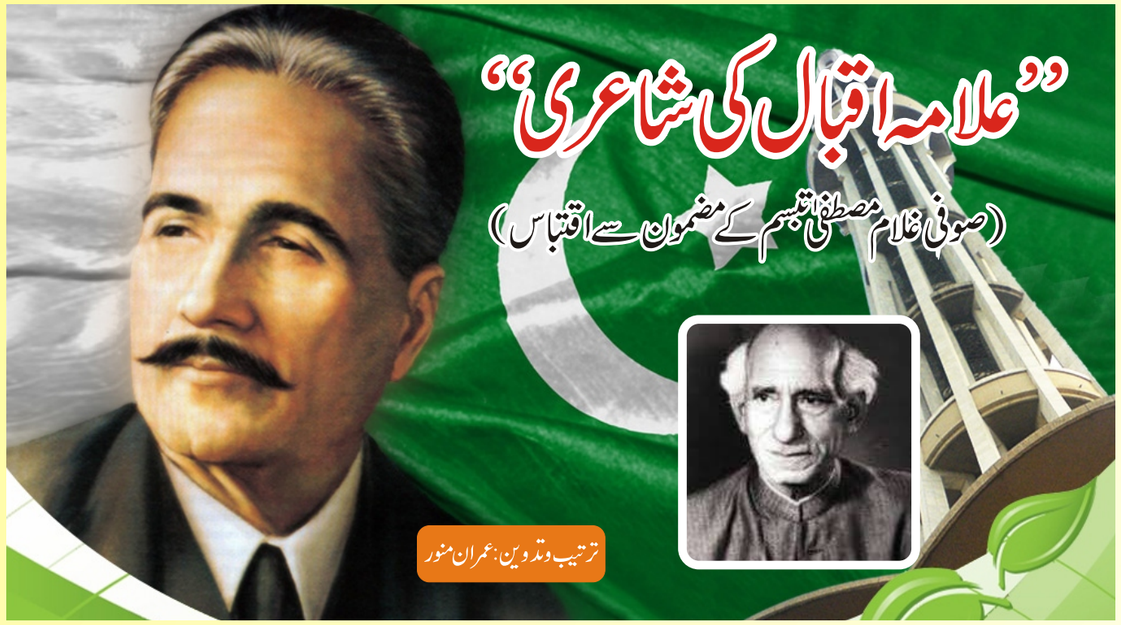

حضرت اقبال کا پیغام کیا ہے؟ اُن کے خیالات واحساسات کی نوعیت کیا ہے؟ اُن کے دل ودماغ کے حلوت کدوں میں کون سے اسرار مضمر ہیں جن کے اظہار کے لیے وہ بے تاب ہیں۔ وہ کون سی آگ ہے جو شرر افشاں آہوں، شعلہ ریز فریادوں اور برق پاش نالوں کے باوجود ابھی تک اُن کے سینے میں فروزاں ہے۔ وہ نے نوازیاں، وہ نغمہ سرائیاں کیا ہیں جن سے وہ خود تڑپتے اور دوسروں کو تڑپانا چاہتے ہیں؟

یہ پیغام رازِ حیات ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا راز جسے اُنہوں نے برسوں کی دل سوزیوں، جگر کاویوں اور اشک ریزیوں کے بعد سمجھا اور اب وہ دوسروں کو سمجھانے کے لیے بے تاب ہیں لیکن جہان میں ایک بھی محرم راز نہیں ملتا جس کے سامنے وہ اِس حقیقت کا اظہار کرسکیں۔ وہ اپنی اِس بیچارگی کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچتے ہیں:

تاب ِگفتار اگر ہست شناسا ے نیست
وائے آں بندہ کہ در سینۂ او راز ے ہست

وائے کس قدر بے بسی کا عالم ہے:

سخنِ تازہ زدم کس بہ سخن وا نرسید
جلوہ خوں گشت و نگاہ ہے بہ تماشا نرسید

ایک اور جگہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے:

تو میرا ذوقِ بیاں دادی و گفتی کے بگوے
ہست در سینۂ من آنچہ بکس نتواں گفت

خدا نے شاعر کو ذوقِ بیاں تو عطا کر دیا لیکن اُس کے رموز واسرار کو سننے والا مفقود ہے۔ اب اگر کوئی جرأت کرے تو کیونکر۔ یہ رموز واسرار تو شعلوں کا حکم دیتے ہیں۔ سوائے اہلِ دل کے کون اِن کا متحمل ہوسکتا ہے۔

زمر ِعشق تو بہ اربابِ ھوس نتواں گفت
سخن از تابوتبِ شعلہ بہ خس نتواں گفت

حضرت اقبال شاعرِ فردا ہیں۔ وہ ان خاکیانِ افسردہ خاطر سے الگ تھلگ ایک نیا جہان بناتے ہیں جس کا آدمِ اوّل وہ خود ہی ہیں اور جہاں کوئی دوسرا اُن کا ہمراز ودمساز نہیں۔ فرماتے ہیں:

دریں مے خانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمِ از عالمے دیگر

اُنہوں نے کائنات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اسرارِ ہستی کو سمجھنے سے پہلے تجسسِ حقیقت کی مختلف منازل طے کر چکے ہیں۔ اوّل اوّل جب اُن کی آنکھ کھلتی ہے تو اُن کی نظر ہندوستان کی تنگ وطنی فضا پر پڑتی ہے۔ وہ وطن کے شیدائی کی حیثیت سے ہندوستان کے گیت گاتے ہیں۔ کوہ ہمالیہ کو وطن کا نگہبان سمجھتے ہوئے اُس کی تعریف میں رطب اللّسان ہوتے ہیں۔ آبنائے وطن کی پست حالت پر نوحہ خوانی کرتے ہیں اور انہیں بیدار کرنے اور اُن کی خوابیدہ روح کو جگانے کے لیے درد بھری فریاد کرتے ہیں۔ ''نیا شوالہ، قومی گیت اور تصویر درد اِسی عہد کی واردات ہیں لیکن جستجوئے حق کی یہ پہلی منزل ہے جب اُن کی نظر ملک ہندوستان کے تنگ دائرے سے نکل کر وسیع فضائے عالم پر پڑتی ہے تو وہ وطن جو کچھ عرصہ پہلے اُن کا نصب العین تھا اپنی ہستی اس وسیع کائنات میں کھو دیتا ہے جہاں انسان کی حیثیت ہندوستانی، ایرانی، تورانی، افریقی نہیں بلکہ اِس معمورۂ عالم کی کثیر تعداد آبادی میں

ایک ادنیٰ فرد کی سی رہ جاتی ہے۔ وطنیت عالمگیر اخوت میں بدل جاتی ہے لیکن اُن کی تجسس کوش نظریں یہاں آکر بھی نہیں رکتیں۔ وہ معمورۂ عالم کو کائنات کا ایک جزو خیال کرتے ہیں جہاں انسانی ہستی ایک ذرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ حقیقتِ کائنات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کے راز کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ علومِ فلسفہ سے استمداد کرتے ہیں اور علم ودانش سے اِس عقدے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں پتہ چلتا ہے کہ موجودہ تہذیب وتمدن کی خرد افروزیاں اِس حقیقت کو منکشف نہیں کرسکتیں۔ لکھتے ہیں:

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ھمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

دانایانِ فرنگ کائنات کو دیکھتے ہیں، فطرت کے گوناگوں مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں، قدرت کی زبردست طاقتوں سے مفید کام بھی لیتے ہیں لیکن اِس کی نیرنگیوں کی حقیقت کو سمجھنا اُن کے فہم سے بالا ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک قلبِ تپاں، ایک چشمِ بینا، ایک خلیلی روح، ایک کلیمی نظر کی ضرورت ہے۔ کیا خوب کہا ہے:

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگر بحرِ شگافید و بہ سینا نرسید

بحر شگافی کے لیے تو آبدوز جہاز کام دے سکتے ہیں لیکن تجلیِ حق کے مشاہدے کے لیے کلیم اللہ کی آنکھ درکار ہے۔ انسانی عقل اشیا کی سطح تک رہتی ہے۔ باطن کی خبر لانے کے لیے روحانی بیداری ضروری ہے:

دلِ بیدار نداند بہ دانائے فرنگ
ایں قدر ہست کہ چشمِ نگرانے دارد

علم ودانش کی یہ افسردہ روحانیت، یہ ٹھوس مادیت، حقیقتِ کائنات کے انکشاف کا جہاں تک تعلق ہے محض سطحیت کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا شاعر اپنے منازلِ جستجو کو روحانی بیداریوں کے سہارے طے کرتا ہے۔ یہ راستہ اگرچہ بہت دور دراز ہے لیکن عاشقِ صادق کے لیے عرصۂ یک گام سے بڑھ کے نہیں اور اگر یہ شرحِ صدر، یہ روحانی کشف، یہ نورِ عشق حاصل ہو جائے تو دونوں جہان پر حاوی ہو جانا آسان ہے۔ یہ آسمان، یہ ستارے، یہ کہکشاں، یہ مہر وماہ واضح ہو کر نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ جبرائیل تو درکنار عرش الٰہی تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ہمارا شاعر کہتا ہے:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

حضرت اقبال نے انسانی دلوں کی تڑپ، سوز وگداز، جستجوئے تلاشِ حق اور پھر وادیٔ عشق کے تمام منازل کا صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان میں یہ تڑپ فطری ہے۔ انسان اگرچہ خاک کا پتلا ہے لیکن اُس کی روح اپنے مرکز کی طرف کھینچی چلی جاتی ہے۔ یہ چیز ہے جو اسے جستجو پر مجبور کرتی ہے۔ یہ چیز ہے جو اسے بے تاب رکھتی ہے۔ استفہامی رنگ میں فرماتے ہیں:

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجاست؟
سبوز ماست ولے بادہ در سبوز کجاست؟
فتم گریں کہ جہاں خاک و ماکف خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ ما دردِ جستجو ز کجاست؟
نگاہ ما بگریبانِ کہکشاں افتد
جنونِ ماز کجا؟ شوزِ ہائے و ہوز کجاست؟

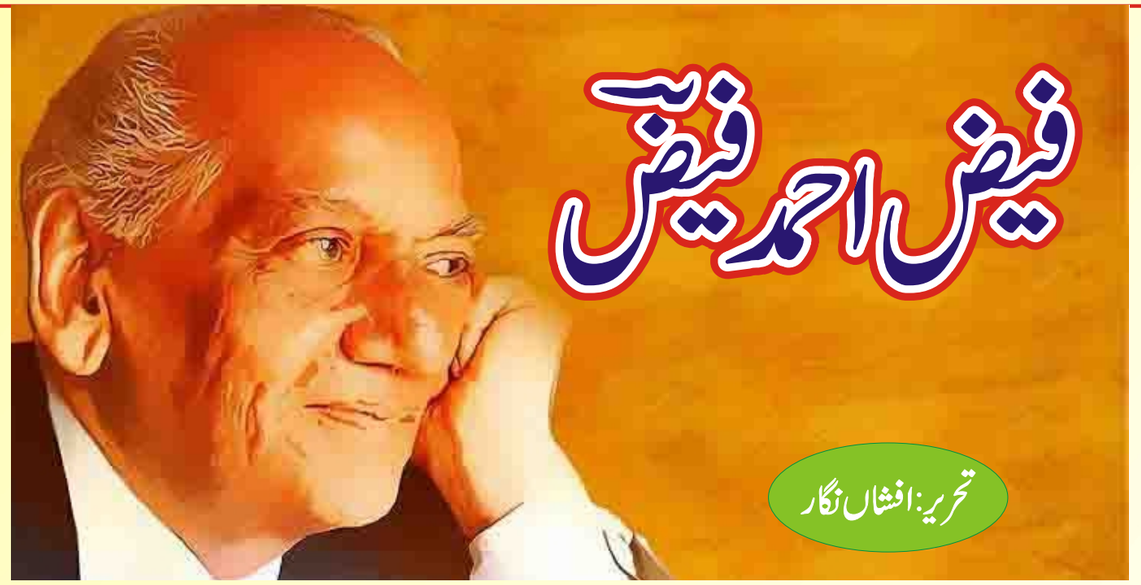

فیض احمد فیض

تحریر: افشاں نگار

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے، رقم کرتے رہیں گے

فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو پنجاب کے ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''کالا قادر'' میں چوہدری سلطان احمد کے گھر پیدا ہوئے۔

آپ مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ کے بعد اُردو کے سب سے عظیم شاعر ہیں۔

فیض احمد فیضؔ نے ابتدائی دینی تعلیم جس میں اُردو، عربی، فارسی اور قرآنی تعلیمات شامل ہیں، محلے کی مسجد میں مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے حاصل کی۔ فیضؔ صاحب کا گھرانا بنیادی طور پر مذہبی تھا مگر اُن کے والد ایک دُور رس انسان تھے اور وہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے، لہٰذا فیضؔ صاحب کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے بعد اُنہوں نے اُن کو سکاچ مشن اسکول بھیجنا شروع کر دیا جہاں سے میٹرک کرنے کے بعد وہ انٹرمیڈیٹ کرنے کے لئے مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ Department of Language and Fine Arts (شعبۂ لسانیات وفنونِ لطیفہ) گورنمنٹ کالج لاہور (موجودہ جی سی یو) میں داخل ہو گئے جہاں اُن کو خوش قسمتی سے پروفیسر میر حسن اور پروفیسر شمس العالم (جو عربی پڑھایا کرتے تھے، جب کہ میر حسن عربی کے ساتھ ساتھ اقبالیات بھی پڑھاتے تھے) جیسے جید اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ پروفیسر میر حسن کی سرپرستی میں فیضؔ نے B.A with Honors in Arabic Language کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۳۵ء میں فیضؔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے انگریزی لیکچرار کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں فیضؔ لاہور چلے آئے اور ہیلے کالج آف کامرس سے بطور پروفیسر وابستہ ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ۱۹۴۲ء میں بطور کیپٹن انڈین برٹش آرمی میں چلے گئے۔ ۱۹۴۳ء میں اُن کی ترقی بطور میجر ہوئی اور ۱۹۴۴ء میں اُن کو Lieutenant-Colonel بنا دیا گیا۔ پاکستان میں وہ مختلف کالجوں میں بھی پڑھاتے رہے اور اِس کے علاوہ اُنہوں نے اخبارات کے لیے بھی خدمات سرانجام دیں جن میں "پاکستان ٹائمز" اور "اَمروز" قابلِ ذکر ہیں۔

دنیائے طنز ومزاح کے بے تاج بادشاہ اور اُردو ادب کے ایک اہم ستون مشتاق احمد یوسفی فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے ذہن پر بہتیرا زور ڈالا کوئی نظیر، کوئی مثال ایسی یاد نہ آئی جہاں لوگوں کو کسی بڑے شاعر کے سیاسی مسلک سے ایسا اختلاف نہ ہو اور اُس کی شاعری و شخصیت سے ایسا گُوٹ کے پیار نہ ہو۔ فیضؔ کے سیاسی مسلک سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اُن کی شاعری اور فیضؔ کی من موہنی شخصیت ہر اختلاف کے تنازعے سے ہمیشہ بالاتر رہی ہے۔ شاید ہی کوئی ادیب شاعر اپنی زندگی میں اُس طرح سراہا گیا ہو جس طرح فیضؔ صاحب سراہے اور چاہے گئے، اور کون ہے جس نے اپنی زندگی میں نصف صدی تک اقلیمِ سخن میں دلوں پر یوں راج کیا ہو اور محبتیں اور عقیدتیں سمیٹی ہوں''۔

فیض احمد فیضؔ وہ بے مثال شاعر ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں پاکستان کی نمائندگی کی ہے۔ اُنہوں نے اپنے کمالِ فن سے علم وادب کی ایک ایسی کہکشاں سجائی ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ اُن کا کلام دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا اور خوشبو کی مانند فضاؤں میں پھیل گیا۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ممتاز شاعر فیض احمد فیضؔ ہمارے ملک کا قابلِ قدر اور قابلِ فخر ادبی سرمایہ ہیں۔

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

بیسویں صدی میں جن تین شعراء نے خاص شہرت حاصل کی اُن میں علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور فیض احمد فیضؔ ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کا مغربی مطالعہ بہت وسیع تھا جس کے زیرِ اثر

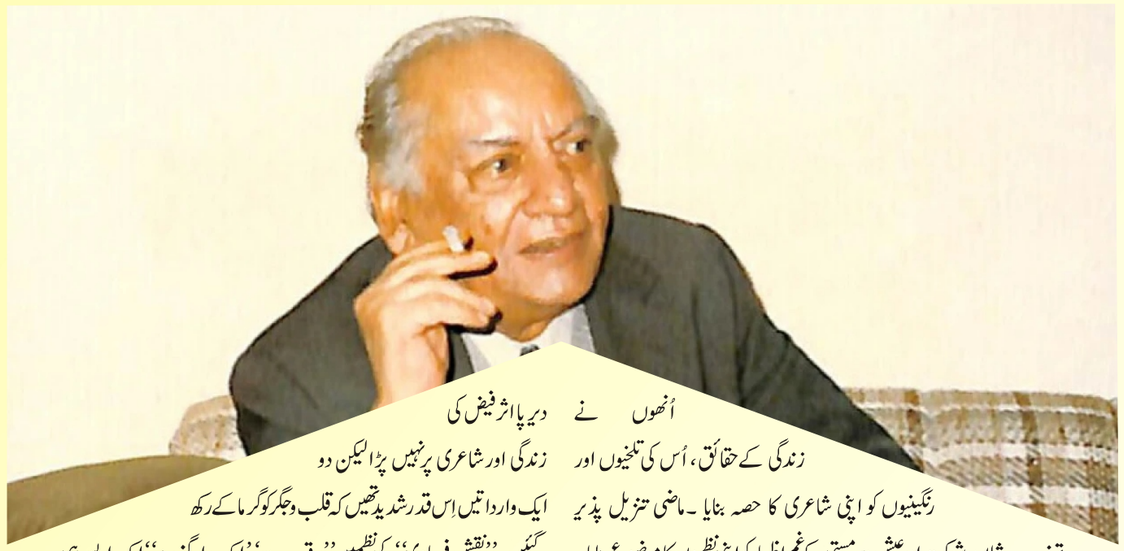

اُنھوں نے زندگی کے حقائق، اُس کی تلخیوں اور رنگینیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ماضی تزئیل پذیر تہذیب، شان وشوکت اور عیش وسرمستی کے غم اظہار کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اُن کی نظموں اور شاعری میں ہمیں رومانیت کے ساتھ ساتھ رجائیت اور اُمید وآفرینی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کے کلام میں دو چیزیں ہمیشہ دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہیں، ایک حُسن وعشق کی واردات اور دوسرا زیردستوں اور مظلوموں سے ہمدردی۔ اُن کی شاعری میں جذبے کی شدت، جمالیاتی عناصر، لہجہ اور اسلوب کی حلاوت ملتی ہے۔

نہ اب رقیب، نہ ناصح، نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا
جُدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

فیض احمد فیضؔ کا مزاج انتہائی سادہ اور نرم مزاج پایا جاتا تھا اور اُن کی طبیعت کی یہی سادگی اور نرم مزاجی اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ آپ کی شاعری کے مجموعوں میں نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندان نامہ، دستِ سنگ سروادیٔ سینا، شامِ شہریاراں، میرے دل میرے مسافر اور نسخہ ہائے وفا (کلیات) شامل ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کی شاعری میں تشبیہات واستعارات کا استعمال بڑے خوبصورت انداز میں نظر آتا ہے۔ آپ نے اُردو غزل کو نیا لہجہ اور ایسا اسلوب عطا کیا جس نے غزل میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مدبھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
حرفِ نفرت کوئی، شمشیرِ غضب ہو جیسے
تا ابد شہرِ ستم جس سے تباہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے

شیر محمد حمید اپنے مضمون (فیض سے میری رفاقت) میں لکھتے ہیں کہ ''ہر معتدل آدمی کی طرح فیض پر بھی عشق کے حادثے گزرے ہیں۔ کچھ عام نوعیت کے رومانی واقعات جن کا دیرپا اثر فیض کی زندگی اور شاعری پر نہیں پڑا لیکن دو ایک وارداتیں اِس قدر شدید تھیں کہ قلب وجگر کو گرما کے رکھ گئیں۔ ''نقشِ فریادی'' کی نظمیں ''رقیب سے''، ''ایک راہ گزر پر'' ایک ایسے ہی حادثے کی یادگار ہیں جس کا اختتام مرگِ سوزِ محبت پر ہوا۔ ایسے حادثے ہر کسی پر گزرتے ہیں لیکن فیض جیسے حُسن بیں اور حُسن آفرین حساس فنکار پر اُن کے جو گہرے اثرات مرتب ہوئے اُن کا سراغ جا بجا اُن کے شعری تخلیقات میں مل جاتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی تھے۔ بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں، وہ نہ برہم ہوتے اور نہ مایوس۔ سب کچھ خاموشی اور تحمل سے برداشت کر لیتے۔ نہ کوئی شکوہ کسی کا نہ گلا، نہ چڑچڑاہٹ نہ بدگوئی۔ کہتے ہیں اُن کے دل میں لاکھ ہیجان برپا ہوں، چہرے پر برہمی کی یا پریشانی کی کوئی لکیر نظر نہیں آتی تھی۔ فیض کا ظرف کتنا وسیع ہے؟ سمندر کی تہہ میں طوفانوں کی رستاخیز ہے، سطح پُرسکون ہے۔ یہ عظمت ہر کسی کو کہاں نصیب؟''

درد آئے گا دبے پاؤں

اور کچھ دیر میں جب پھر میرے تنہا دل کو
فکر آلے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سُرخ چراغ
وہ جو اِک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پر ہر نقش دمک اُٹھے گا

فیض احمد فیضؔ کو عمر کے آخری حصہ میں دمہ کا مرض لاحق ہو گیا اور 19 نومبر 1984ء کو لاہور میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

شبلی نعمانی

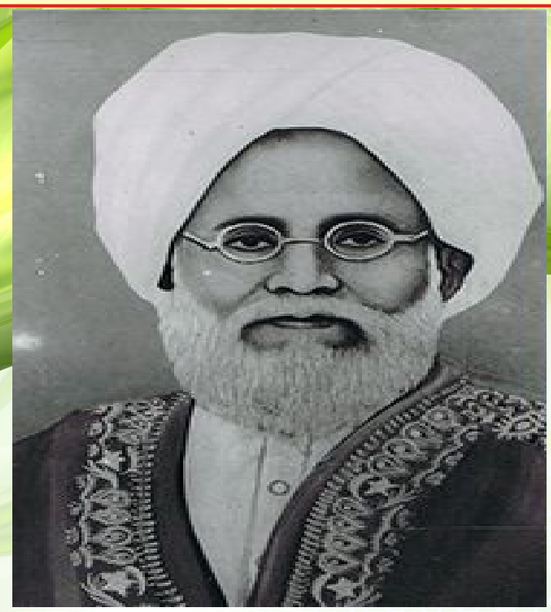

تحریر و تحقیق: سیمین حیات

مورخ ،مصنف، شاعر۔ اعظم گڑھ ،یو پی کے نواحی قصبے بندول میں 1857ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل تھے۔ آپ نے تعلیم مندول، اعظم گڑھ، جونپور، چڑیا کوٹ، غازی پور، لاہور، دیوبند، رام پور اور سہارنپور میں پائی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد فاروق، مولانا فیض الحسن، مولانا ارشاد حسین اور مولانا احمد علی قابلِ ذکر ہیں۔ 1876ء میں حجاز کا سفر کیا۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا۔ 1882ء میں اُن کا تقرر علی گڑھ کالج میں ہوا۔ سرسید کی صحبت کا بھی خاصہ اثر ہوا اور خاصہ اختلاف بھی۔ 1898ء میں علی گڑھ سے مستعفی ہو کر حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں چار سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر اعظم گڑھ میں ''دارالمصنفین'' کی بنیاد ڈالی۔ اُن کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ''ندوۃ العلما'' کا قیام ہے۔ 1911ء میں مولانا شبلی نے ''انجمن وقف علی الاولاد'' کے سیکرٹری کی حیثیت سے قائداعظم سے رابطہ کیا جب قائداعظم نے وقف کا بل مرکزی اسمبلی میں پیش کیا تھا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں خاص طور پر ندوۃ العلما کی قرارداد کا ذکر کیا تھا۔

آپ نے 18 نومبر 1914ء کو وفات پائی۔ مولانا کی تصانیف لاتعداد ہیں۔ زیادہ مشہور یہ ہیں: شعرالعجم (پانچ جلدیں)۔ الفاروق، سیرت النعمان، المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، سفرنامہ روم و مصر و شام اور نگزیب عالمگیر پر ایک نظر۔ سیرت النبی ﷺ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جو نا تمام رہ گئی۔ اُن کے لائق شاگرد سید سلیمان ندوی نے مکمل کی۔

شبلی نعمانی نے اپنے اسلوبِ بیاں کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ آپ کی نثر نگاری کی بات کریں تو اِس میں سادگی اور بے ساختگی کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آپ کی نثر میں سادگی سرسید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی سے بالکل الگ ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ لکھا بہت ہی سادہ اور روانی کے ساتھ لکھا۔ اُن کی نثر نگاری میں ہمیں شاعرانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اُن کے الفاظ خوبصورت، دلکش اور مترنم ہوتے تھے۔ اپنی نثر نگاری میں شاعرانہ رنگ کو اختیار کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی نے تشبیہات، استعارات اور محاورات کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے کیا ہے جس نے اُن کی نثر نگاری کو چار چاند لگائے۔ نثر نگاری میں شاعرانہ رنگ کا انداز شبلی نعمانی ہی کا خاصا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی چونکہ ایک ادیب تھے اور یہ ادبیت اُن کی تاریخ نگاری میں بہت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تنقید چونکہ ہمیشہ سے ایک خشک موضوع رہا ہے لیکن آپ نے اِس میں بھی شگفتہ اور دلکش ادبی زبان کا استعمال کر کے اسے ایک خوبصورت رنگ دیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی نثر میں ایک خوبی یہ ہے کہ اُن کی تحریروں میں تحقیقی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ تاریخ نگاری ہو یا سوانح نگاری یا تنقید نگاری، اُن کی ادبی کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی نعمانی نے جو لکھا تحقیق کر کے لکھا۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اُن کی نثر نگاری ہو یا شاعری، اُس میں تخیل کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ آپ ایک ادیب، شاعر، مؤرخ اور تاریخ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ گداز دل کے مالک فلسفی بھی تھے۔ اُن کے خیالات فلسفیانہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نثر میں تخیل کا رنگ موجود ہے۔ اُن کی نثر نگاری میں ایک رنگینی کا تاثر بھی ملتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے جہاں بہت سے دلکش اسلوب اپنا کر اپنی تحریروں کو جاذبِ نظر بنایا ہے وہی انہوں نے اِن تحریروں میں جوشِ بیاں سے بھی کام لیا ہے۔ غور کیا جائے تو نثر ہو غزل ہو یا نظم، یہ عنصر اُن کی تحریروں میں ہمیشہ غالب رہا ہے۔ یہاں تک کہ پڑھنے والا بھی اپنے دل میں وہی جوش وجذبہ محسوس کرتا ہے جو شبلی نعمانی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

شبلی نعمانی کی نثر میں اعجاز و اختصار کی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔ اُنہوں نے بڑی سے بڑی بات کو وسیع اور وسیع موضوع کو چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں میں بہت خوبصورتی سے شامل کیا ہے۔ نثر نگاری میں یہ خوبی انہیں اپنے شاعر ہونے کی وجہ سے حاصل رہی۔ اُنہوں نے شعری وسائل کے ذریعے اپنی تحریروں میں اعجاز و اختصار پیدا کیا۔

شبلی نعمانی کی شخصیت اور اُن کے فن کا جہاں اعتراف کیا جاتا رہا ہے وہی اُن کے فن پر اعتراضات بھی کیے جاتے رہے ہیں لیکن دوسری طرف اُن کے چاہنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی زندگی ہر قسم کے نشیب و فراز سے گزری۔ مخالفتوں کا سامنا بھی رہا اور محبت کی چاشنی سے بھی دل بھرا رہا۔ مولانا شبلی نعمانی کا شمار اُردو کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کو شاعری، اور شاعری کی تنقید سے خاص انسیت تھی۔ شبلی نعمانی نے نہ صرف شاعری بلکہ اِس کے دیگر لوازمات سے متعلق اپنے نظریات کو ''شعرالعجم'' میں مفصل طور پر پیش کیا ہے۔ ''شعرالعجم'' کی چوتھی جلد کی ابتدا ہی میں فرماتے ہیں کہ'' جو بحثیں اگلے حصوں میں ناتمام رہ گئی تھیں، اُن کو اب تفصیل سے لکھتا ہوں۔ یہ حصہ تین حصوں پر منقسم ہے۔

۱: شاعری کی حقیقت اور ماہیت،

۲: فارسی شاعری کی عام تاریخ اور تمدن اور دیگر اسباب کا اثر۔

۳: تفریظ و تنقید

دراصل خصوصاً ''شعرالعجم'' مولانا شبلی نعمانی کی وہ کتاب ہے جس میں اُنہوں نے اپنے خیالات بالخصوص فنی شاعری کے بارے میں اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

شاعری کے اصل عناصر تاریخ اور شعر کا فرق، شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق جیسے مسائل پر مدلل بحث کی ہے تاکہ شاعری کے جملہ معاملات واضح ہو جائیں۔ اِس کے علاوہ وہ لفظ اور معنی کی بحث کرتے ہیں اور اُن کی مختلف نوعیّتوں کو پیش بھی کرتے ہیں۔ شبلی نعمانی نے مختلف مثالوں سے شاعری کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے نزدیک شاعری کا منبع ادراک نہیں بلکہ احساس ہے۔ اِس کے بعد وہ ادراک اور احساس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

''خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں۔ اُن میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں۔ ادراک اور احساس۔ ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا ہے اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کی ایجادات، تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔ احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلے کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اِس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی کی حالت میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔''

مولانا شبلی نعمانی کے تصور کے اعتبار سے تمام عالم ایک شعر ہے۔ زندگی میں جگہ جگہ شاعری بکھری پڑی ہے اور جہاں شاعری موجود ہے اُن کے نزدیک وہاں زندگی ہے۔ ایک یورپین مصنف کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ

''ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے، شعر ہے۔''

شبلی نعمانی نے اُردو کی تمام کلاسیکی اصناف کا جائزہ لیا ہے اور اِس پر اپنی رائے قائم کی ہے۔ اُن کا نقطۂ نظر تاثراتی اور جمالیاتی نظر آتا ہے لیکن شاعری کی دوسری خوبیوں پر بھی اُن کی نگاہ رہتی ہے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' میں اُنہوں نے شاعری کی صنعتوں کی جس طرح تشریح کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اِس لیے جس صنعت کے ضمن میں اُنہوں نے جو شعر نقل کیے ہیں ہم آج بھی اُس کے حصار سے کُلی طور پر باہر نہیں نکل سکے۔ یہی مولانا شبلی نعمانی کا اعجاز ہے۔

’بھیتا‘
ہندوستانیوں کے ہاں نفرت کا ایک استعارہ

محمد سعید احمد شیخ

لندن کے وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم کے ایک گوشے میں کچھ یادداشتوں اور دستاویزات کو محفوظ کیا گیا ہے جو تاج برطانیہ کے اُس عہدِ عروج سے متعلق ہیں جس کے بارے میں مشہور تھا کہ ملکہ کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ اِس گوشہ کو باؤرنگ کولیکشن (Bowring Collection) کا نام دیا گیا ہے، یعنی باؤرنگ کی جمع کی گئی چیزیں۔ لیون بنتھام باؤرنگ ہندوستان میں تعینات رہنے والا ایک آئی۔سی۔ایس آفیسر تھا جس نے اپنے ذاتی شوق کے سبب ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں، میروں اور نوابوں وغیرہ سے متعلق دستاویزات، تصاویر اور عمومی دلچسپی کے دیگر مواد کا ذخیرہ اکٹھا کیا۔

باؤرنگ چھبیس سال (۱۸۴۳ء تا ۱۸۷۰ء) تک انڈین سول سروس کا حصہ رہا۔ اِس کی پہلی تعیناتی لاہور کے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ (جو آج کل کے اسسٹنٹ کمشنر کے مساوی عہدہ تھا) کے طور پر ہوئی۔ آٹھ سال (۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۲ء) یہ وائسرائے ہندلارڈ کیننگ کا پرائیویٹ سیکرٹری رہا اور ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان میسور کے چیف کمشنر کے اہم ترین عہدے پر بھی تعینات رہا۔

دیگر انگریز سرکاری افسروں کی طرح باؤرنگ بھی تاجِ برطانیہ کا نہایت وفادار اور فدا کار کارندہ تھا۔ گو کہ ۱۸۷۰ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد یہ لندن واپس چلا گیا تاہم ہندوستان کے سحر نے وہاں بھی اِس کا دَامن نہ چھوڑا اور اپنی بقیہ تمام عمر یہ لندن میں بیٹھ کر ہندوستان سے متعلق اپنی یادداشتوں کو محفوظ کرنے میں صرف کرتا رہا۔

مخطوطوں، تصاویر اور دیگر دستاویزات کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ باؤرنگ نے ہندوستان کے مختلف حکمرانوں کی سوانح حیات پر ولیم ولسن ہنٹر کے شروع کردہ کتابی سلسلہ، جس کا نام ’رولرز آف انڈیا سیریز‘ تھا، میں میسور کے حیدر علی اور اُس کے بیٹے ٹیپو سلطان پر ایک کتاب بھی لکھی۔ یہ قابل انگریز اپنے مرنے سے قبل اتنا قابل ذکر تحقیقی کام چھوڑ گیا کہ تاجِ برطانیہ کو اپنے میوزیم کا ایک گوشہ اِس سول سرونٹ کے نام سے منسوب کرنا پڑا۔ ’باؤرنگ کولیکشن‘ اکتیس جلدوں پر مشتمل تصویری کتاب کی شکل میں بھی برٹش لائبریری لندن میں موجود ہے۔

وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم کے باؤرنگ کولیکشن کی ہر ہر دستاویز اپنے اندر ایک منفرد، دردناک اور تکلیف دہ داستان کو چھپائے ہوئے ہے۔ کہیں کسی دیسی ریاست کے حکمران کا کوئی خط انگریزوں کی کسی عہد شکنی، چیرہ دستی یا تعدی کی چغلی کھاتا نظر آتا ہے تو کہیں کسی راجے، مہاراجے، میر اور نواب کی تصویر میں اُس کی آنکھوں سے جھلکتی بے نام اُداسی ہندوستان کی سیاسی اَبتری اور معاشی بدحالی کی منظر کشی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کسی انگریز مصور کی بنائی کوئی تصویر (Painting) غیر محسوس طریقے سے ہندوستانیوں کو معمولی اور گھٹیا ثابت کرتی دکھائی دیتی ہے تو کہیں دوستی کے نام پر کئے جانے والے کسی معاہدے کی شقیں انگریز سرکار کی بالادستی کی روز بروز بڑھتی ہوس کا بھانڈہ پھوڑتی نظر آتی ہیں۔

ہندوستانیوں کا حاکم سے محکوم بننے کا سفر:

اِس بات میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی یا تاجِ برطانیہ نے ہندوستان میں جو کامیابیاں سمیٹیں، اُن میں بڑا عمل دخل انگریزوں کی اپنی صلاحیتوں کا تھا۔ نہ تو وہ کبھی لندن سے سُورت، بمبئی، کلکتہ اور مدراس تک کے ہزاروں میل کے سفر کی صعوبتوں سے گھبرائے اور نہ ہی اُنہیں کبھی ہندوستان کے سخت موسمی حالات نے پریشان اور دِق کیا۔ بس اپنی معاشی، سیاسی، سماجی اور عسکری بالادستی کی دھاک بٹھانے کی ایک لگن تھی جس کے سبب یہ خم ٹھونک کر سرزمینِ ہندوستان پر اپنے جائز و ناجائز مفادات کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر کرتے رہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ نہ تو اُنہیں ہندوستانیوں کی انفرادی اور اجتماعی تذلیل پر کہیں تاسف ہوا اور نہ ہی وہ کبھی ہندوستان کے معاشی استحصال پر شرمندہ یا نادم نظر آئے۔

تاہم اِسی تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ تاجِ برطانیہ کی کامیابیوں کے پسِ پردہ ہندوستانیوں کی اپنی کوتاہ بینیوں کا بھی بڑا عمل دخل تھا کہ وہ بار بار بلکہ ہر بار، چند ٹکوں، زمین کے چند قطعات یا انگریز سرکار کے آنریری مجسٹریٹ جیسے نمائشی عہدوں کے لالچ میں اَپنوں سے نمک حرامی اور ماں دھرتی سے غداری کے مرتکب ہوتے رہے۔ گو کہ غداری انگریزوں کے ساتھ سرزمینِ ہندوستان پر وارد ہونے والی کوئی نئی چیز نہیں تھی، تاہم جس شدومد کے ساتھ اِن موقع پرستوں نے اِسے ایک حرفت کے طور پر پروان چڑھایا اِس کی ہندوستان کی تاریخ میں نظیر ڈھونڈنا محال ہے۔

انگریز برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر (Charter) کے تحت خالصتاً تجارتی مقاصد کیلئے ہندوستان آئے۔ کسی بھی ابتدائی دستاویز سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ اُن کا مدعا اور مقصودِ نظر تجارت کے علاوہ کچھ اور ہو۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انگریز تاجروں کے روپ میں کشور کشائی کی غرض سے ہندوستان آئے، محض ایک مبالغہ ہے۔

تاہم ہندوستان میں معمولی تنخواہ پر خوش دلی سے لڑنے والے سپاہیوں کی باآسانی اور وافر دستیابی، برطانیہ میں تیار ہونے والے اسلحہ بالخصوص توڑے دار بندوقوں کی بہترین کارکردگی، فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی سے چپقلش (جو ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۳ء کے درمیان ہونے والی تین کرناٹک جنگوں پر منتج ہوئی) کے سبب انگریزوں کی حربی مہارت میں اضافہ اور ہندوستان کے انتہائی ابتر سیاسی حالات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرتا دھرتاؤں کو اِس بات پر اُکسایا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سیاسی اور عسکری تسلط بھی قائم کر لیں۔ معاشی اجارہ داری تو وہ بہت پہلے ہی بڑی کامیابی کے ساتھ قائم کر چکے تھے۔

ایک پکا ہوا سیب انگریزوں کی جھولی میں گرنے لگا تھا تو وہ اپنی دامن کیوں سمیٹ لیتے؟

غداریوں اور بے ضمیریوں کی اَلم ناک داستان:

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں پہلی بڑی کامیابی جنگِ پلاسی

(۲۳ جون ۱۷۵۷ء) میں نواب سراج الدولہ کو شکست دیکر بنگال پر قبضہ کرنا تھا۔ چوبیس سالہ اِس با حوصلہ، غیرت منداور دلیرنواب کو اِس جنگ میں محض اپنے سپہ سالار میر جعفر کی غداری کے باعث شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ عین اُس وقت جب جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، یہ غدار انگریز کمانڈر لارڈ کلائیو سے جاملا۔

چنانچہ مذکورہ بالا اِسی غیر متوقع کامیابی سے حوصلہ پا کر ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج نے چندسال بعد (یعنی ۱۷۶۴ء میں) جنگِ بکسر میں بنگال کے میر قاسم، دہلی کے شاہ عالم ثانی اوردکن کے نواب شجاع الدولہ کی متحدہ افواج کو بھی شکست دی۔ تجارت کی غرض سے ہندوستان کی خاک چھاننے والوں کو محض ایک غدار کی کوتاہ بینی نے کشور کشائی کا راستہ دکھا دیا۔

انگریزوں کی اگلی بڑی اوراہم کامیابی ۱۷۹۹ء میں میسور کی لڑائی میں ٹیپو سلطان کو شہید کر کے ریاستِ میسور پر اپنا تسلط قائم کرنا تھا۔ اِس لڑائی میں میر صادق نے اپنی غداری، بے غیرتی اور بے حمیتی کے سبب اُنہیں اپنے راستے کی آخری رکاوٹ عبور کرنے یعنی ٹیپو سلطان ایسے شیر کو ہندوستان کے سیاسی منظر نامہ سے ہٹانے میں کامیابی دلوائی۔ غدار پروری اب انگریزوں کے فنِ سیاست کا لازم و ملزوم حصہ بن چکی تھی۔

قصہ کوتاہ، ہندوستان کی سرزمین پر لڑی جانے والی اِن تینوں بڑی، اہم اور فیصلہ کن جنگوں میں انگریزوں نے غداروں اورنمک حراموں کی شہ سے ملنے والے حوصلے کے سبب سے ہی کامیابی حاصل کی۔ میر جعفراور میر صادق کی غداری اور بے وفائی اتنی تکلیف دہ اور دُوررس نتائج کی حامل تھی کہ علامہ محمد اقبالؒ جیسی حساس الطبع شخصیت کو بلا تکلف یہاں تک کہنا پڑا کہ یہ دونوں غدار اپنی ملت، اپنے دین اوراپنے وطن کیلئے ننگ، عاراورشرم کا درجہ رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ایک اور جگہ پر شاعرِ مشرق نے میر جعفراور میر صادق ایسے غداروں اورنمک حراموں کی تکذیب اِن جیسے سبھوں سے اللہ کی پناہ مانگ کربھی فرمائی:

الامان! از روحِ جعفر، الامان!
الحذر! از جعفرانِ ایں زمان

ہندوستان کے سماجی نظام میں غداری کی تکذیب کا معاملہ:

عربی زبان کے الفاظ 'غدار' اور 'مُحتال' اورفارسی لفظوں 'گربُز' اور 'فریبندہ' کے مقابلے میں سنسکرت، ہندی اورریختہ (اُردو معلٰی) وغیرہ میں نمک حرام، مفسد، دھوکہ دینے والے اور منافق شخص کو 'بھِیتا' کہا جاتا ہے۔ اورصرف لغات یا کتب کی حد تک نہیں، ہندوستانیوں کی عام بول چال میں بھی 'بھِیتا' کا لفظ نمک حرام یا غدار کے مترادف کے طور پر عام بولا جاتا تھا اور یہ تحقیر کا ایک بھرپور استعارہ بھی تھا۔

موجودہ بھارت کی ریاستِ مغربی بنگال کے شہر مرشدآباد کے علاقے لال باغ میں موجود میر جعفر کے محل (جس کا نام اُس نے 'جعفر جنگ' رکھا تھا) کو آج بھی نفرت اور حقارت کے سبب 'نمک حرام کی حویلی' یا 'بھیتے کی ڈیوڑھی' کا نام دیا جاتا ہے۔ اِس عمارت کا داخلی دروازہ عالمی ادارے یونیسکو (UNESCO) کی تاریخی عمارات کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ اب یہ لفظ 'بھیتا' کے عام ہندوستانیوں میں مقبول ہونے کے سبب سے ہی تھا کہ اِس ادارے کی دستاویزات میں بھی اِسے 'ٹریٹرز گیٹ' (Traitor's Gate) یعنی 'غدار کے دروازے' کے ہی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

''نوجوان ورتھر کی داستانِ غم''

ٹھیک دوسو برس ہوئے، دسمبر 1884ء میں جرمنی میں ایک چھوٹی سی کتاب چھپی "نوجوان ورتھر کی داستانِ غم"۔ کتاب کا مصنف گمنام تھا مگر اُس کا نام زیادہ عرصہ تک چُھپا نہ رہ سکا کیونکہ اِس کتاب نے نہ صرف جرمنی میں تہلکہ مچادیا بلکہ بہت جلد فرانس، انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ترجمے کے ذریعے لوگوں تک پہنچ گئی اوردھڑا دھڑ اِس کے بے شمار ایڈیشن چھپنے لگے۔ اِس کتاب کا پچیس سالہ مصنف مستقبل میں جرمن زبان کا مایہ ناز شاعراورادیب گوئٹے تھا۔ عجیب بات ہے کہ زندگی میں اسے اِس چھوٹی سی جذباتی اوررومانی ناولٹ کی بنا پر زیادہ شہرت ملی بہ نسبت اپنی آفاقی تحریروں کے۔

یہ کتاب خطوط کی شکل میں لکھی گئی تھی جونوجوان ورتھر اپنے دوست ولہم کولکھتا ہے۔ ورتھر ایک شادی شدہ لڑکی سے جو ورتھر کے دوست البرٹ کی حسین وسلیقہ مند بیوی ہے محبت کرنے لگتا ہے۔ اِس مُثلّث کا وہی انجام ہوتا ہے جوکسی شادی شدہ عورت سے بے پناہ محبت کا عموماً ہوتا ہے یعنی دردناک ٹریجڈی۔ ورتھر مایوسی اورغم کی حالت میں اپنے دوست البرٹ کی پستول سے خودکشی کر لیتا ہے۔ اُس کی محبوبہ لوٹ بعد میں محبت کی اِس کسک کو محسوس کرتی ہے مگراب بہت دیر ہو چکی ہے۔ پھر وہ اپنے شوہر کو بہت چاہتی ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس صورتحال سے کس طرح نمٹے اورکون اِس ٹریجڈی کا ذمہ دار ہے؟

یہ کہانی دراصل گوئٹے کی آپ بیتی ہے جو اُس نے ایک ہم عمر نوجوان یروشلم کی خودکشی کے بعد لکھی۔ بدنصیب یروشلم کو بھی گوئٹے کی طرح ایک نوجوان شادی شدہ عورت سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ بہت غمگین رہتا تھا اور بالآخر محبت کی ناکامی میں اُس نے خودکشی کر لی۔ نوجوان گوئٹے کو بھی شارلٹ نامی ایک عورت سے محبت تھی۔ وہ اُس کے گھر میں بہت سا وقت گزارتا تھا مگر شارلٹ کو اپنے شوہر کیٹنر سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ گوئٹے کو چاہتی تو تھی۔ اُس کا خیال بھی رکھتی تھی اوراُس کا دل توڑنا پسند نہ کرتی تھی مگر وہ گوئٹے کی محبت کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ شارلٹ کا شوہر وضعداری کی بنا پر منہ سے کچھ نہ بولتا مگراُن کے تعلقات میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ گوئٹے نے کوشش کی کہ وہ کہیں دور چلا جائے۔ اُس نے ایک سفیر کے ہاں ملازمت بھی کی مگر بات نہ بنی۔ وہ نڈھال ہو کر ممکن ہے خودکشی کر لیتا۔ اُس کے ذہن میں ایسے منصوبے بھی آئے مگر نوجوان یروشلم کی خودکشی کے واقعہ نے اسے سہارا دیا اوروہ اِس کہانی کو انجام تک لکھنے بیٹھ گیا۔ ورنہ آج شاید ہم ''فاؤسٹ'' جیسے شہرہ آفاق ڈرامے سے بھی محروم رہتے۔

بظاہر یہ محبت کی کہانی ہے جہاں احساس اور جذبے کی شدت اپنی انتہا پر پہنچی نظر آتی ہے لیکن اِس کتاب کی شہرت اورعظمت کی دوسری بہت سی وجوہات بھی ہیں۔ سرمایہ داری اور مشینی دور کا نوجوان بہت ذہین ہے مگر شاید اُس کے خلوص کی سادگی اور جذبے کی شدت میں ٹھہراؤ اور مصلحتی انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ممکن ہے وہ ایسی محبت کو سمجھ بھی نہ سکے جو آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے لیکن اٹھارویں صدی کے نصف میں جب یورپ جاگیرداری دور سے صنعتی دور کی جانب قدم بڑھا رہا تھا ایسی اندھا دُھند اور تُند محبت کرنا غیر معمولی بات نہ تھی۔

رچرڈسن نے ''پامیلا'' لکھ کر خطوط کے ذریعے ناول لکھنے کا جو رواج شروع کیا تھا اسے گوئٹے نے بھی اپنایا مگر اختصار اور مہارت کے ساتھ اور کچھ اُس کے عظیم ذہن نے ناول کا انداز یوں رکھا کہ آج دوسو برس گزرنے کے بعد بھی کتاب کی اہمیت برقرار ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے آدمی کھوسا جاتا ہے۔ ورتھر کی داستان میں غم اور محبت کی گھٹتی بڑھتی

پرچھائیوں میں اپنے آپ کو تلاش کرنے لگتا ہے۔

گوئٹے خود جاگیرداری معیشت کا پروردہ تھا مگر وہ کہیں بھی اِس نظام کی بناوٹی قدروں پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتا۔ ورتھر ایک جگہ خط میں لکھتا ہے:

"یہاں کا غریب طبقہ مجھے ابھی سے جان گیا ہے۔ وہ سب مجھے بہت چاہتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے طبقے کے بہت سے لوگ اِس اندیشے کا شکار ہیں کہ اپنے سے کم تر انسانوں کے قریب جا کر وہ کچھ گنوا دیں گے۔ اُن کی عزت اور وقار پر حرف آئے گا۔"

یورپ میں یہ پہلا ناول تھا جس میں یوں کھل کر سماجی برائیوں اور روایتی سوچ پر حملہ کیا گیا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"مجھ سے پوچھو کہ یہاں کے کیسے لوگ ہیں تو میں کہوں گا کہ جیسے دنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ نسلِ انسانی میں یکسانیت ہی تو سب سے نمایاں چیز ہے۔ سب ہی انسان زندہ رہنے کی دوڑ میں جُتے ہوئے ہیں اور اِس مسلسل دباؤ کے بعد انہیں جو برائے نام آزادی حاصل ہوتی ہے وہ اسے بھی گنوانے پر تیار ہیں"۔

گوئٹے کا یہ ناول ایک رومانی داستان ہی نہیں بلکہ سوچ کا وہ تُند دھارا ہے جس نے اپنے دور کی جھوٹی اور نمائشی قدروں کو نفرت سے جھٹک دیا۔ ایک جگہ ایسے ہی اوپری اور بناوٹی انسانوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"وہ لوگ جو دوسروں کو دکھانے کی خاطر بہت سے کام کرتے ہیں، جھوٹی شہرت حاصل کرتے ہیں، کھوکھلی بنیادوں پر اپنی حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دولت بنانے کے اچھے برے دھندوں میں پھنسے ہیں، زیادہ عرصے میں اپنے خول میں نہیں چُھپ سکتے، بہت جلد اُن کا کردار نعرہ بازی تک محدود ہو جاتا ہے"۔

اِس ناول کی عظمت اور اپنے وقت میں جداگانہ حیثیت کی ایک بڑی وجہ اِس کا نفسیاتی انداز ہے۔ واقعات اور حادثوں کے سہارے تو ہر فنکار اپنی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے مگر گوئٹے اِن واقعات کے سہارے محبت میں سرشار اپنے ہیرو کی روح کھینچ کر باہر لایا ہے اور یہ اُس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

"میں اپنے دل کو کسی بیمار بچے کی طرح سنبھالتا ہوں، اُس کی ہر خواہش پوری کرتا ہوں"۔

ایک جگہ لکھتا ہے:

"ہے کوئی ایسا آدمی جو رنجیدہ ہونے کے باوجود اتنا وضع دار ہو کہ دوسروں کے سامنے اپنے جذبات کو خندہ پیشانی سے چھُپا لے اور اُن کی مسرتوں پر اپنی محرومیوں کا سایہ نہ پڑنے دے"؟

اِس کتاب کو ہم یورپ میں تخلیق کیے جانے والے بہترین ادب کی ایک اہم کڑی کہہ سکتے ہیں۔ سوچ کا جو انقلابی رویہ اِس چھوٹے سے رومانی ناول میں نظر آتا ہے وہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتا۔ نیچر سے گوئٹے کا والہانہ عشق یوں ظاہر ہوتا ہے

"نیچر ہی میں ابدی خزانے پوشیدہ ہیں اور وہی عظیم فنکار کو جنم دے سکتی ہے، اِس دنیا کی تمام زندہ چیزوں میں مجھے بچے سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ اِن بچوں کی معصومیت اور ستھری طبیعت کی تو ہمیں پیروی کرنی چاہیے اور ہم ہیں کہ انہیں اپنی رعایا سمجھتے ہیں"۔

گوئٹے نے سماجی بندشوں اور بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کیا اور اِس پہلو نے ورتھر کی داستانِ غم کو ایک متنازع ناول کا روپ دے دیا۔ گوئٹے کو بہت غصہ آیا جب گرجے کے نئے پادری اور اُس کی بیوی کے کہنے پر برسہا برس پرانے اُس کے محبوب درخت کاٹ دیے گئے۔ جن کی باوقار ٹھنڈی چھاؤں اور حُسن پورے علاقے کو طمانیت بخشتا تھا۔ اِس کوفت میں وہ اِس طبقے کے سب ہی نمائندوں کو لپیٹ لیتا ہے۔

"کتنے دکھ کی بات ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو اِن باقی ماندہ چند چیزوں سے بھی کوئی لگاؤ نہیں جو دنیا کے حُسن میں آج بھی اضافہ کر رہی ہیں۔ مَیں شہزادہ ہوتا تو ایسے تمام لوگوں سے نمٹ لیتا لیکن مَیں شہزادہ ہوتا تو مجھے بھلا پیڑوں سے کیا لگاؤ ہوتا۔"

"خوشی، غم، دکھ، درد سب کچھ برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اِس حد سے گزرنے کے بعد انسان ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں آدمی کے کمزور اور مضبوط ہونے کا سوال نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اِس جسمانی یا روحانی تکلیف کو جھیل جائے گا۔ ایسے آدمی کو جو خودکشی کرے بُزدل کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی جان لیوا بیماری میں مبتلا آدمی کی موت کو بُزدلانہ کہنا۔"

ذاتی محبت، محرومیوں، مایوسیوں، آرزوؤں اور مسرتوں کو نفسیاتی اور فکری سانچوں میں ڈھال کر جس طرح اِس ناول میں دو سو برس پہلے سمیٹا گیا ہے وہ بہت سے نقادوں کے مطابق سرگوشیوں میں فرانسیسی انقلاب کی پیشگوئی تھی۔ فکر میں ایک انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ شاید اسی لیے نپولین اِس کتاب کو ہر سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

سعیدہ گزدر

فروری 1975ء

جون ایلیاء

غزل

یوں مجھے کب تک سہو گے تم
کب تک بتلا رہو گے تم
دردمندی کی مت سزا پاؤ
اب تو مجھ سے تنگ آ جاؤ
میں کوئی مرکزِ حیات نہیں
وجہِ تخلیقِ کائنات نہیں
میرا ہر چارہ گر نڈھال ہوا
یعنی مَیں کیا ہوا! وبال ہوا
جونؔ غم کے ہجوم سے نکلے
اور جنازہ بھی دُھوم سے نکلے
اور جنازے میں ہو یہ شورِ خزیں
آج وہ مر گیا جو تھا ہی نہیں

سارے رشتے لفظ سے ہیں، لفظ کے ہیں اور لفظ میں ہیں۔ جو خیال بھی ہے، تصور بھی اور معنی بھی۔ ہم اور تم اور وہ سب جو ہماری باتیں سن رہے ہیں، لفظ میں سوچتے ہیں لفظ کی لذت میں جیتے ہیں اور لفظ کی اذیت میں مرتے ہیں۔ ہم لفظوں ہی میں ملتے اور لفظوں ہی میں بچھڑتے ہیں۔ لفظ ہی اپناتے ہیں اور لفظ ہی گنوا دیتے ہیں۔

(جون ایلیاء)

جون ایلیا 14 دسمبر 1936ء کو امروہہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ اُن کا گھرانہ علم و ادب کے ماہرین کا گھرانہ ہے۔ اُن کے والد محترم سید شفیق حسن ایلیا کئی علوم کے جامع اور متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ جون صاحب نے ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل کیا۔ تقسیم برصغیر کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور یہاں ایک عرب عالم جواد المقستی سے عربی کے درس لیے۔ پھر اُردو میں ایم اے، عربی میں فاضل اور فارسی میں کامل کی اسناد حاصل کیں۔ جون صاحب نے شاعری تو آٹھ برس کی عمر میں شروع کر دی تھی۔

پیشہ ورانہ مصروفیات کا آغاز 1958ء میں کراچی سے ماہنامہ ''اِنشاء'' کے اجراء سے ہوا۔ 1964ء میں یہی رسالہ ''عالمی ڈائجسٹ'' کے نام سے شائع ہونے لگا اور 1988ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ 1963ء سے 1968ء تک جون صاحب اسماعیلیوں کے تحقیق و تصنیف کے بڑے ادارے سے وابستہ رہے جہاں آپ نے اسلامی تاریخ و فلسفہ سے متعلق متعدد اہم کتب کے ترجمے کیے۔ 1967ء میں ترقی اُردو بورڈ نے اُردو لغت کی تیاری کا آغاز کیا تو اُس نے جون صاحب کی خدمات حاصل کر لیں۔ جون صاحب نے 1976ء تک لغت کی تدوین میں حصہ لیا۔ 1979ء میں جون صاحب اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے وابستہ ہوئے جہاں اُنہوں نے مشہور فلسفی محقق طوسی کی علم کلام پر دقیق کتاب ''تجرید'' کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ 1988ء میں عالمی ڈائجسٹ کے بند ہونے کے بعد ایک ماہنامہ ''روشن خیال'' کے نام سے جاری کیا۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں۔ ''نظم مجموعۂ کلام'' شاید''۔ نثر: 20 عدد تصانیف اور تراجم مسیح بغداذ' حلاج۔ اسماعیلیت، شام و عراق میں، مطالعہ طواسین، ۔ اسماعیلیت، یمن میں۔ تہذیب۔ رہائش و کشایش۔ فرنود۔ تجرید۔ مسائلِ تجرید۔ رسالہ حکمتی۔ عدد۔ کتاب الطّواسین۔ قاطیغوریاس۔ اخبار الحلاج۔ باراماناس۔ جوہر صقلی۔ جومطریا۔ اسماعیلیت 'جزیرہ عرب میں۔ ایساغوجی۔ حسن بن صباح۔

☆☆☆

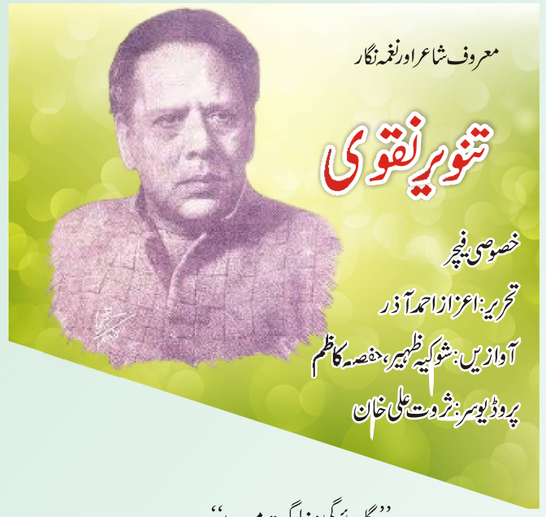

’’گائے گی دنیا گیت میرے‘‘

چاندنی رات کے کسی پچھلے پہر میں ہوا کی لہروں میں جُھولتا جُھومتا یہ گیت آج بھی جب سماعتوں سے ٹکراتا ہے تو یوں لگتا ہے وقت منجمد ہو گیا ہے، گردشِ دوراں تھم گئی ہے اور ماحول پر ایک سحر سا طاری ہو گیا ہے۔ یہ تنویر نقوی کی شاعری ہے۔

تنویر نقوی جنہیں قدرت نے گداز دل، ترنم دھڑکنیں اور کومل جذبوں کا شاعر بنایا تھا۔ گیت تنویر نقوی کی فکر میں ڈھلتے تو احساسات اور قص کا ترنم جاگ اُٹھتا اور نغمگی خود اپنے سراپا پر ناز کرنے لگتی۔

جانِ بہاراں 'رشکِ چمن
غنچہ دہن، سیمیں بدن، اے جانِ من

قدرت نے یہ ملکہ تنویر کی فکرِ رسا کو عطا کیا تھا۔ گیت خواہ اُردو زبان کا ہو، پنجابی زبان کا یا فارسی زبان کا، تنویر نقوی کے بول گلوکار کے سُروں میں ڈھلتے تو دِلوں میں اترتے چلے جاتے

یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم (احمد رشدی)

کِھلتی ہوئی رنگت، گھٹا ہوا جسم، گھنگریالے بال اور بہت دلکش خدوخال۔ تنویر نقوی دیو مالائی کہانیوں کے مطابق گویا نغموں کے دیوتا تھے۔ دھیما لہجہ، زبان میں مٹھاس اور لبوں پر کھیلتی ایک ملکوتی مسکراہٹ تنویر نقوی کو ہزاروں میں ممتاز کرتی تھی۔ لفظوں کی صورت گری تنویر نقوی کا کمالِ فن تھا۔ ترتیبِ لفظی اور تکرارِ لفظی کو شعری جمالیات کا پیکر بنا دینا تنویر نقوی کا حصہ ہے۔ رواں بولتے ہوئے، مکالمہ کرتے ہوئے بول تنویر نقوی کی گیت نگاری کا اعجاز ہے۔

’’ جدوں ہولی جئی لینداں میراناں،
میں تھاں مرجانی آں (میڈم نور جہاں)

بیس بائیس عمر کی نوعمری میں "آواز دے کہاں ہے دنیا میری جواں ہے" اور "جواں ہے محبت حسیں ہے زمانہ " جیسے سحر انگیز گیت تنویر نقوی کی فنی اور فکری اُٹھان تھے۔ تنویر رومانوی گیت لکھتے تو دھڑکنوں کے تار چھیڑ دیتے۔ کومل جذبوں کو زبان اور بے نام رشتوں کو پہچان مل جاتی تھی۔ گیت کے بول موسیقی کی دُھنوں کو راستہ دکھاتے سُر اور تان کی انگلی تھام لیتے اور زندگی نغمہ و آہنگ کی رِم جھم میں یوں کھو جاتی کہ

کلی کلی منڈلائے بھنورا ، کہیں بھی چین نہ پائے

انسان دوست رویے تنویر نقوی کا شخصی امتیاز تھا۔ شخصی انسان کا اعتراف اور فروغ تنویر کا نظریہ فن بھی تھا۔ سماجی قدروں کی پامالی اور انسان کی انسان کے ہاتھوں تذلیل تنویر نقوی کے حساس دل کے لیے ایک تازیانہ تھی۔

عشقِ رسول ﷺ تنویر نقوی کے گیتوں اور نغموں میں اپنی تابانیوں کے نصف النہار پر دکھائی دیتا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کی سرشاری تنویر کی نعتیہ گیت نگاری میں سرور و سرمستی کی کیفیت کو اُجاگر کرتی ہے۔ لفظ لفظ متحرک، ایک ایک بول تقدس، ایک ایک حرف پاکیزگی کی علامت اور ایک ایک مصرعہ تنویر نقوی کی عقیدتوں کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ 1950ء کی دہائی میں بننے والی فلم "نورِ اسلام " کے لیے تنویر نقوی کی نعت برصغیر کی پوری تاریخ میں فلمی نعت نگاری کا ایک منفرد سنگِ میل ہے۔ کاروانِ عقیدت کا منزلِ شوق کی جانب اُٹھتا ایک ایک قدم جذبوں سے اُمڈتا کیف و سرور اور آنکھوں سے جھلکتی عقیدتوں کی بے اختیاری اِس نعت میں تنویر نقوی کے عشقِ رسول ﷺ سے منور سینے کی جھلک پیش کرتی ہے۔

شاہِ مدینہ، شاہِ مدینہ، یثرب کے والی سارے نبی تیرے در کے سوالی

1965ء کی پاک بھارت جنگ قومی زندگی کا معجزہ نما واقعہ ہے۔ دس کروڑ بکھرے ہوئے لوگ راتوں رات ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی صورت ایک قوم بن گئی۔ وہ قوم جس کا ایک ایک فرد اپنی بہادر افواج کے شانہ بشانہ دفاعِ وطن کا استعارہ بن گیا۔ افواجِ پاکستان جغرافیائی سرحدوں پر دادِ شجاعت دے رہی تھیں تو ہمارے فنکاروں، گلوکاروں موسیقاروں اور شاعروں نے ثقافتی محاذ سنبھال لیا تھا۔ غازیوں اور شہیدوں کو خراجِ تحسین کے نغمے محاذ پر افواجِ پاکستان کے لہو کو گرما رہے تھے تو اندرونِ ملک فرزندانِ وطن کے جذبوں کی زبان بنے ہوئے تھے۔ ایسے میں تنویر نقوی شہیدوں کے لہو کو نئی صبح کا شفق رنگ اُجالا قرار دے رہے تھے۔

فقیرانہ مزاج اور درویشانہ طرزِ حیات تنویر نقوی کا طرۂ امتیاز تھا۔ حیات آمیز اور حیات آموز نغمے تخلیق کرنے والا یہ فنکار عمرِ عزیز کے صرف باون (52) برس ہی گزار سکا اور یکم نومبر 1972ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ آج ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی تنویر نقوی اپنے گیتوں میں زندہ ہیں اور جب تک اِس دھرتی پر محبتوں، گیتوں اور موسیقی کی رِم جھم رِم جھم پھوار پڑتی رہے گی یہ نت کا پیار زندہ تابندہ اور پائندہ رہے گا۔

رِم جھم رِم جھم پڑے پھوار۔۔۔ تیرا میرا نت کا پیار

ریڈیو پاکستان لاہور پیشکش

آکوپنکچر 6000 سال پرانا طریقۂ علاج ہے جس کی شروعات چین سے ہوئیں۔

آکوپنکچر کا استعمال زیادہ تر دائمی اور شدید درد کے علاج میں کیا جاتا ہے۔

آکوپنکچر کے ماہرین جسم کے اعصابی نظام کو فعال کرنے کے لیے مخصوص حصوں میں سوئیاں چبھوتے ہیں۔ جدید طریقۂ علاج میں شامل ڈرائی نیڈلنگ آکوپنکچر کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

سوئی چبھ جائے تو درد ہوتا ہے لیکن آکوپنکچر ایک ایسا طریقہ علاج ہے جس میں درد کا علاج سوئیاں چبھو کر کیا جاتا ہے۔

آکوپنکچر چین کا قدیم روایتی طریقۂ علاج ہے اور اِس کی جڑیں تاریخ میں چھ ہزار سال سے زیادہ پیچھے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قدیم چینی حکماء کا نظریہ تھا کہ انسان کا جسم ایک مخصوص توانائی پر کام کرتا ہے جسے انہوں نے 'چی' کا نام دیا۔

قدیم چینی فلسفے میں انسانی جسم کے اندر لگ بھگ 2000 ایسے پوائنٹس ہیں جن تک چینل نیٹ ورک انرجی (چی) پہنچاتا ہے۔

گزشتہ برسوں کے دوران آکوپنکچر پر ہونے والی میڈیکل ریسرچ میں بتایا گیا ہے کہ اِس طریقۂ علاج میں سوئیوں کی مدد سے مرکزی اعصابی نظام کے اہم پوائنٹس کو متحرک کیا جاتا ہے جس سے اعصاب، ریڑھ کی ہڈی اور دماغ میں مخصوص کیمیکل خارج ہوتے ہیں جو جسم کے اِس قدرتی نظام کو فعال کر دیتے ہیں جس کا تعلق شفایابی اور بیماری پر کنٹرول سے ہوتا ہے۔

ہارورڈ میڈیکل اسکول میں ہونے والی ایک تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ آکوپنکچر دماغ کو پیغام بھیجنے والے اعصابی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے اور اُن نیورانز کو متحرک کرتا ہے جو سوزش روکنے میں مدد دیتے ہیں۔

آکوپنکچر پر ایک ریسرچ کے دوران ظاہر ہوا کہ جب جسم میں پھیلے ہوئے اعصابی نظام کے کسی حصے میں سوئیاں چبھوئی جاتی ہیں تو اِس دوران دماغ کے سکین میں برقی ارتعاش پیدا ہوتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ آکوپنکچر دماغ اور اعصاب کے درمیان پیغام رسانی کے عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔

آکوپنکچر کے ماہرین صرف اِس حصے میں سوئیاں چبھوتے ہیں جہاں سے اعصابی نظام کے سرکٹ گزر رہے ہوتے ہیں۔ اگر اِس مقام سے ہٹ کر سوئی چبھوئی جائے تو وہ فائدے کی بجائے الٹا نقصان دیتی ہے۔ اس لیے آکوپنکچر کا انتخاب کرتے وقت یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس طریقۂ علاج کے کسی ماہر کا ہی چناؤ کیا جائے۔

آکوپنکچر اور فزیوتھراپی میں کیا فرق ہے؟

ورجینیا میں ڈاکٹر آف فزیکل تھراپی ڈاکٹر افشاں مبشر نے آکوپنکچر اور فیزیوتھراپی کے درمیان فرق پر بات کرتے ہوئے کہا کہ آکوپنکچر بنیادی طور پر اعصاب کے کھچاؤ، درد اور ٹینشن دور کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اِس مقصد کے لیے جسم کے مخصوص حصوں میں سوئیاں چبھوئی جاتی ہیں جب کہ فزیوتھراپی کسی طبی صورت حال کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہے، مثلاً سرجری کے بعد اعصاب کی فعالیت کو بحال کرنا وغیرہ ہے۔

اُن کا کہنا تھا کہ امریکہ میں چینی آکوپنکچر کا استعمال محدود ہے کیونکہ اکثر ہیلتھ انشورنس کمپنیاں اِس طریقۂ علاج کو سپورٹ نہیں کرتیں جس کی وجہ سے آکوپنکچر کلینک جانے والے اکثر مریضوں کو اپنی جیب سے علاج کرانا پڑتا ہے۔ تاہم امریکہ میں صحت کے اکثر مراکز میں فزیوتھراپی کے ساتھ ڈرائی نیڈلنگ تھراپی کی سہولت فراہم کی جاتی ہے جو چینی آکوپنکچر کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ درد کی کئی کیفیات میں آکوپنکچر فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے جن میں کمر یا گردن کا درد، گھٹنوں کا درد جو اتھرائٹس کہلاتا ہے۔ اسی طرح سرجری کے بعد کے درد، کچھ مخصوص دواؤں کے استعمال کے نتیجے میں ہونے والے درد سے آرام حاصل کرنے میں بھی آکوپنکچر مفید ہے۔

عفاف شیخ کہتے ہیں کہ ڈرائی نیڈلنگ سے شفایابی کی شرح 80 فی صد سے زیادہ ہے۔ اُن کے ہاں 10 میں سے صرف دو مریض ہی ایسے ہوتے ہیں جو پوری طرح صحت یاب نہیں ہو پاتے۔

اِس موضوع پر کیے جانے والے 20 مطالعاتی جائزوں کے اعداد و شمار کے تجزیے سے، جن میں 6376 افراد سے انٹرویوز کیے گئے تھے، معلوم ہوا کہ آکوپنکچر کرانے کے ایک سال کے بعد تک گردن کے درد کے سوا دیگر تمام درد دوبارہ ظاہر نہیں ہوئے تھے۔

تنقید اور جارحانہ اصلاح، اصلاح کے بجائے فساد کا سبب بنتا ہے۔ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں یا لکھ ڈالتے ہیں یہ سوچے سمجھے بغیر کہ منفی تحریروں اور باتوں کے کتنے نقصانات ہوتے ہیں اور جس کے نتائج بھی زہریلے مرتب ہوتے ہیں کیونکہ اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ پہلے تولو پھر بولو۔ لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر تحریر کریں کیونکہ تقریر سے زیادہ تحریر اثر انداز ہوتی ہے۔

رویوں میں تشدد اور عدم برداشت کیوں اور کیسے بڑھ رہا ہے۔ 1970ء تک یہ وبا اتنی عام نہیں تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی بات کو توجہ سے سنتے تھے۔ اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال ملحوظِ خاطر رکھا جاتا تھا۔

اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارہ ''یونیسکو'' کی تحریک پر 1993ء میں عالمی سطح پر برداشت (Tolerance) کے عنوان سے قوانین متعارف کروائے گئے جبکہ 1995ء کو عالمی سالِ برداشت قرار دیا گیا اور ہر سال 16 نومبر کو عالمی یومِ برداشت قرار پایا جو کہ ہر سال پوری دنیا میں باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔ کوئی قوم اُس وقت تک معاشرے میں مثبت اثرات نہیں چھوڑ سکتی جب تک اُس میں برداشت کا مادہ نہ ہو۔ یہ سمجھنا ہمارے لیے اَز حد ضروری ہے کہ برداشت کے بغیر خواہ وہ ایک شخص ہو، ایک فرد ہو یا معاشرہ، ایک قوم ہو یا اقوامِ عالم، اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھیں تو اسلام کی اساس دراصل برداشت ہے جس کا عملی مظاہرہ مرکزِ دین، خلقِ اعظم، امام و فخرِ رُسل حضرت محمد ﷺ نے اپنی حیاتِ مظاہرہ میں کر کے دکھایا۔ کائنات میں برداشت، رحمت یہ سب اوصافِ حمیدہ حضرت محمد ﷺ کی مثال اِس دنیا میں نہ کسی کی ہے اور نہ ہوگی۔ ہر سال عالمی یومِ برداشت منانے کا مطلب اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ عالمی قوتیں اگر برداشت کے اصل معنوں کو جاننا چاہتی ہیں تو اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ 10 محرم الحرام 61ھ کو کربلا کے میدان میں امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے جان نثاروں کا صبر و برداشت ہمیں برداشت کا وہ سبق دیتے ہیں کہ جس پر چل کر، اِس پر عمل پیرا ہو کر ایک فرد، معاشرہ، قوم یا اقوامِ عالم کے لیے منزلِ مقصود کا حصول یقینی ہے۔

حالات کا جائزہ لیں تو ہر طرف قوم پرستی کی ایک دوڑ لگی ہے۔ اِس خود پرستی کی دوڑ میں شامل قوتوں نے برداشت جیسے بنیادی عمل کو یکسر نظر انداز کر رکھا ہے جس کی بنیاد پر قومی تشخص پامال ہو چکا ہے۔ کسی بھی قوم کی بقاء اس کے تحمل آمیز رویوں اور برداشت پر مضمر ہے۔ ایسے میں کائنات کی پہلی نظریاتی مملکت ''پاکستان'' نے عالمی سطح پر برداشت کی ناقابلِ فراموش داستانیں رقم کی ہیں جو آج بھی اپنی بقاء اور اقوامِ عالم میں قیامِ امن کے لیے مسلسل قربانیاں دے رہا ہے۔

نو مارچ 2011 کا دن اُبھرتے سورج کی سرزمین جاپان میں معمول کے مطابق طلوع ہوا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ شام ہوتے ہوتے یہ دن کتنی تباہی کی داستانیں رقم کر کے غروب ہوگا۔ میں اُس وقت این ایچ کے ورلڈ ریڈیو جاپان میں اُردو زبان کے اسپیشلسٹ کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ مجھے جاپان میں آئے صرف دو ماہ ہوئے تھے اور ابھی میں جاپان کے رہن سہن، وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار کو سمجھنے کی سعی کر رہا تھا۔

نو مارچ کا وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے۔ صبح دس بجے کے قریب مَیں دفتر پہنچا تھا۔ اُس دن ہماری اُردو سروس کی پروڈیوسر یوکو ساتا کے صاحبہ کے ساتھ ریکارڈنگ تھی۔ دوپہر کو تقریباً ڈھائی بجے کے قریب مَیں اور یوکو ساتا کے صاحبہ ریکارڈنگ کے بعد اپنے ڈیسک پر بیٹھے کسی اگلے پروگرام کے حوالے سے بات چیت کر رہے تھے کہ ایک دم سے یوکو ساتا کے صاحبہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی کہ زلزلہ آ رہا ہے۔ مَیں اسے معمول کی بات سمجھا کیونکہ جاپان میں زلزلہ آنا عام سی بات ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی تمام عمارت ایک دم سے ہلنے لگی اور لوگوں کی چیخوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ لوگوں نے اپنی بنیادی تربیت کے سبب میزوں کے نیچے پناہ لینا شروع کر دی لیکن اُس وقت تک ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ جاپان کے ایک ساحلی حصے میں قیامتِ صغریٰ برپا ہو چکی ہے۔ چند لمحوں میں ہی ٹیلی وژن پر یہ خبریں شروع ہوگئیں کہ سونامی کی وارننگ جاری کر دی گئی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی این ایچ کے لوگ الرٹ ہو گئے اور ہمارے پاس خبریں آنا شروع ہوگئیں۔ یہ صرف تباہی کی خبریں تھیں۔ ریکٹر سکیل پر زلزلہ کی شدت 8 درجے سے زیادہ تھی۔ سونامی نے ہر طرف تباہی مچا دی تھی لیکن اِس شدید تباہی کے دوران بھی مَیں نے جاپانی قوم کو انتہائی پُر سکون لیکن مستعد پایا۔ سب لوگ تندہی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے کہیں افراتفری نہیں تھی۔ ہمارے معمول کے پروگرام معطل کر دیے گئے تھے اور ہمیں کہا گیا کہ آپ دفتر میں رکیں اور آنے والی تازہ ترین خبروں کو اپنے سامعین تک براہ راست پہنچائیں گے۔ اُس وقت تمام ٹرین سروس معطل کر دی گئی تھیں اس لیے ہمارے باقی ساتھیوں کا دفتر پہنچنا مشکل تھا۔ دفتر میں موجود ساتھیوں کے ساتھ ہمیں ہی تمام پروگرام کرنے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا تباہی کی خبروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن سب سے پریشان کن خبر اُس وقت آئی جب پتا چلا کہ سونامی کی لہریں فوکوشیما کے ایٹمی بجلی گھر سے ٹکرا گئی ہیں اور وہاں سے ایٹمی تابکاری کا خطرہ ہے۔ اُس دن مجھے جاپانیوں کی بہت ساری خصوصیات کا علم ہوا کہ بحیثیت قوم وہ کس قدر منظم ہیں۔ اِس سارے دورانیے میں مَیں نے کسی بھی لمحے کہیں بھی افراتفری نہیں دیکھی۔ رات کے دو بجے جب ہم اُس دن کا کام ختم کر کے باہر نکلے تو مَیں نے ایک حیران کن منظر یہ دیکھا کہ لوگ قطار میں لگ کر ٹیکسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ قطار کم و بیش آدھا کلو میٹر طویل ہوگی لیکن رات کے اِس پہر کہ جب جاپان پر قیامت ٹوٹے کم و بیش بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں اور لوگ اپنے گھر والوں کی خیریت سے بھی پوری طرح باخبر نہیں ہیں تو نہ تو کوئی دھکم پیل ہے اور نہ ہی کوئی مار دھاڑ بلکہ لوگ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اُس دن کسی ٹیکسی ڈرائیور نے کسی سواری سے من چاہا کرایہ وصول نہیں کیا۔ اُس کے بعد آنے والے دنوں میں ہم نے جاپانیوں کا ایک دوسرے کے لیے جذبۂ ایثار دیکھا۔ کسی نے آنے والے دنوں کے لیے چیزیں ذخیرہ نہیں کیں اور نہ ہی دوکانداروں نے چیزوں کی قیمتیں بڑھائیں۔ سونامی کے حوالے سے ہم نے پروگرام کیے تو اُس میں بھی ہمیں جذبۂ ایثار کی کئی مثالیں ملیں لیکن ایک مجھے خاص طور پر یاد ہے کہ ایک لڑکی مقامی بلدیہ کے دفتر میں لوگوں کو آنے والی سونامی سے خبردار کرنے کی ڈیوٹی پر مامور تھی۔ وہ اعلان کرتی رہی حتیٰ کہ سونامی کی لہریں خود اُسے بہا کر لے گئیں۔ اُس نے جان دے کر بہت سارے اور لوگوں کی جان بچالی۔

پھر اگلے ایک سال کے دوران مَیں نے جاپانیوں کا جذبہ تعمیرِ نو دیکھا تو مجھے ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کے بعد جاپان کے دوبارہ معاشی قوت بننے کی کہانی یاد آ گئی۔ ایک سال بعد مجھے جاپان کے سونامی سے شدید متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ میرے میزبان جاپان میں مقیم ایک کاروباری شخصیت تھے جنھوں نے مجھے اُس تمام متاثرہ علاقے کا دورہ کرایا لیکن یقین جانیں اگر میرے میزبان نہ بتاتے تو مجھے کبھی یقین نہ آتا کہ یہ علاقے محض ایک سال قبل سونامی کی تباہی کا شکار ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے خاص طور پر مجھے وہاں کے ایک پرائمری اسکول کی عمارت دکھائی جس کی دوسری منزل پر لگا گھڑیال اسی وقت پر رُکا ہوا تھا جس وقت سونامی کی لہریں اُس سے ٹکرائی تھیں اور اُس گھڑیال کو دیکھ کر اُس علاقے میں آنے والی تباہی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُس سونامی کی طاقت کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں نے ایک چھوٹے بحری جہاز کو سڑک پر دیکھا اور میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ سونامی کی لہریں اِس جہاز کو سمندر سے بہا کر سڑک پر لے آئی تھیں۔

سطحِ زمین پر آنے والے زلزلے تو ہزاروں مکانات اور بلند و بالا عمارتوں کو زمین بوس کر دیتے ہیں مگر زیرِ آب آنے والے زلزلے اُن سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ سمندر کی کئی سو فٹ اونچی بے قابو لہریں کسی آسیب کی طرح ساحل کی جانب دوڑتی ہیں اور آن کی آن میں شہروں اور آبادیوں کو ڈبو دیتی ہیں۔ بہرحال جاپان نے اِس قدرتی آفت سے آنے والی تباہی سے تعمیرِ نو تک کا سفر بہت تیزی اور حوصلہ مندی سے طے کیا۔ سونامی سے آگاہی کے اِس عالمی دن کے موقع پر اللہ کریم سے دُعا ہے کہ وہ تمام عالم کو سونامی کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھے، آمین

عالمی یومِ اطفال کے موقع پر

ایک لڑکی

مرزا ادیب

استنبول کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا۔ ترکی کا بڑا مشہور شہر ہے۔ پرانے زمانے میں اسے قسطنطنیہ کہتے تھے۔ کئی سال گزرے جب ترکی میں کمال اتاترک اپنے ملک کی آزادی کے لئے انگریزوں اور یونانیوں سے جنگ کر رہے تھے، خالدہ ادیب خانم کا نام ہر جگہ بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ خالدہ ادیب خانم، اتاترک کے رفیقوں میں سے تھی اور اُن کی ہدایت میں رات دن کام کرتی رہتی تھی۔ یوں تو خالدہ ادیب خانم کا ہر شخص بڑا احترام کرتا تھا مگر اسکولوں کی لڑکیاں تو اُس سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ ہر وقت اُس سے ملنے کے لئے بے چین رہتی تھیں۔ انہی لڑکیوں میں ایک لڑکی عائشہ بھی تھی۔ عائشہ استنبول کے ایک گاؤں میں رہتی تھی اور اسی گاؤں کے ایک مدرسے میں پڑھتی تھی۔ عمر اُس کی دس گیارہ سال ہوگی۔ گاؤں میں کبھی کبھی کوئی اخبار پہنچ جاتا تھا اور جب یہ اخبار عائشہ کے ہاتھ میں آتا تھا تو وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ خالدہ ادیب خانم نے کیا نیا کام کیا ہے اور کہاں کہاں تقریر کی ہے۔ اُس نے خالدہ کی تقریر کبھی نہیں سنی تھی مگر کئی بار اُس کی تازہ تقریر کے الفاظ اخبار میں پڑھے تھے۔ یہ الفاظ اُس نے بڑی خوبصورتی سے اپنی کاپی میں لکھ رکھے تھے۔

عائشہ جس اسکول میں پڑھتی تھی اُس کی ایک استانی کا نام جمیلہ تھا۔ یہ استانی عائشہ اور دوسری لڑکیوں کو خالدہ ادیب خانم کی باتیں بتایا کرتی تھی اور انہیں باتوں سے عائشہ کو خالدہ ادیب خانم سے ایسی محبت ہوگئی تھی جیسی ایک بچی کو اپنی ماں سے ہوتی ہے۔ عائشہ خالدہ کو ماں کیوں سمجھتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ عائشہ کی اپنی ماں اُس وقت فوت ہوگئی تھی جب یہ دودھ پیتی بچی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اُس کی بڑی بہن نے اسے پالا اور اسے اپنی بڑی بہن سے بھی بڑا پیار تھا۔ عائشہ کا بڑا جی چاہتا تھا کہ کسی دن خالدہ ادیب خانم سے ملے مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ خالدہ ایک شہر میں رہتی ہی نہیں تھی۔ کبھی اِس شہر میں ہے تو کبھی دوسرے شہر میں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ عائشہ نے خالدہ ادیب خانم کی تازہ تقریر پڑھی۔ تقریر پڑھنے کے بعد تو اُس کی خالدہ سے ملنے کی خواہش بہت بڑھ گئی۔ اُس نے اپنی استانی جمیلہ سے کہا۔ استانی جی ! میں کس طرح خالدہ ادیب خانم سے مل سکتی ہوں؟

استانی نے جواب دیا "عائشہ ! یہ تو بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی ادھر آئیں تو بات بن سکتی ہے۔ لیکن وہ اس گاؤں میں بھلا آئیں گی کیوں۔ البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے۔

وہ صورت کیا ہے استانی جی ! عائشہ نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ وہ صورت یہ ہے کہ تم اُن کو ایک خط لکھ دو اور اُس میں لکھ دو کہ جب آپ کبھی اِدھر سے گذریں تو مجھے بتا دیں۔ میں خود آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ یہ بات سن کر عائشہ کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ اسکول سے گھر گئی تو جلدی جلدی روٹی کے دو تین نوالے حلق سے اتارے اور کاغذ قلم لے کر ایک کمرے میں جا بیٹھی۔ خط لکھنے کو تو وہ بیٹھ گئی مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے شروع کس طرح کرے اور اپنے دل کی بات کس طرح لفظوں کے ذریعہ بیان کرے۔ اُس کی بہن نے دیکھا کہ عائشہ گھر میں آئی ہے تو اطمینان سے روٹی کھانے کے بجائے کاغذ قلم لے کر الگ کمرے میں چلی گئی ہے تو اسے یہ فکر ہوئی کہ ضرور امتحان میں فیل ہوگئی ہے اور استانی نے اسے جھڑکا ہے۔ اس لئے اسکول کا کام کر رہی ہے۔ مگر جب اسے عائشہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ تو خالدہ ادیب خانم کو خط لکھ رہی ہے تو اُس کی فکر دور ہوگئی اور وہ خط لکھنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

عائشہ نے یہ خط اِس طرح لکھا جس طرح ایک بچی پردیس میں جا کر اپنی ماں کو لکھتی ہے۔ اُس نے سب سے پہلے لکھا پیاری ماں ! اور اُس کے بعد اپنی خواہش بیان کی۔ اپنے حالات بھی لکھے اور اسکول کا پتہ بھی۔ جب یہ خط لکھ چکی تو اُس کی بڑی بہن نے پوچھا' عائشہ خالدہ ادیب خانم کا پتہ تو تمہیں معلوم ہی نہیں تمہارا خط اُن کے پاس جائے گا کس طرح؟ عائشہ نے بتایا" باجی استانی جی نے کہا تھا خط لکھ کر تم لے آنا۔ لفافے پر پتہ مَیں خود لکھ دوں گی۔ اور دوسرے دن خط عائشہ نے استانی کو دے دیا۔ خط لکھنے کے بعد عائشہ اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ کئی روز گزر گئے۔ جواب نہ آیا۔ کئی ہفتے بیت گئے پھر بھی خالدہ ادیب خانم کی طرف سے ایک سطر تک نہ ملی۔ اب تو عائشہ پریشان ہوگئی۔ اسے اُمید تھی کہ اُس کے خط کا جواب ضرور آئے گا لیکن ڈیڑھ مہینہ گذر گیا اور کوئی جواب نہ آیا۔

وہ استانی سے پوچھتی تھی باجی ! میرا خط اُن کو ملا تھا؟" استانی کہتی ضرور ملا ہوگا'۔

'پھر جواب کیوں نہیں آیا؟ عائشہ سوال کرتی۔

استانی اسے بتائی کہ خالدہ ادیب خانم بہت مصروف عورت ہے رات دن کام کرتی ہے۔ اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملی ہوگی کہ تمہارے خط کا جواب دے سکے۔ ایک روز عائشہ اسکول پہنچی تو اُس کی استانی بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے بتایا عائشہ خالدہ ادیب خانم کی طرف سے ایک آدمی اطلاع دے گیا ہے کہ کل خالدہ ہمارے گاؤں کے قریب سے گزریں گی۔ ہم سب اُن سے ملنے کے لئے جائیں گے۔"

عائشہ یہ بات سن کر اتنی خوش ہوئی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی اِس خوشی میں وہ استانی سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ خالدہ ادیب خانم سے ملنے کے لئے جانا کس وقت ہے۔ خوش خوش گھر آئی اور اپنی باجی کو یہ خوش خبری سنا دی۔ باجی نے پوچھا یہ تو بتاؤ جا ؤ گی کسی وقت؟

اب عائشہ کو معلوم ہوا کہ اُس نے وقت تو پوچھا ہی نہیں ہے۔ اُس کی ایک سہیلی جو اُس کی جماعت میں پڑھتی تھی قریب ہی رہتی تھی۔ عائشہ بھاگی ہوئی وہاں پہنچی اور پوچھا کہ لڑکیاں خالدہ ادیب خانم سے ملنے جائیں گی کسی وقت؟ اُس کی سہیلی نے بتایا صبح نو بجے۔

عائشہ ساری رات نہ سو سکی صبح ابھی آٹھ ہی بجے ہوں گے کہ وہ جاگ کر اسکول پہنچ گئی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ لڑکیاں تو صبح چھ بجے ہی چلی گئی تھیں۔ عائشہ کو اِس کا بہت دکھ ہوا۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ گھر واپس آ گئی۔ باجی نے تسلی دی مگر اُس کی آنکھوں سے آنسو رکتے ہی نہیں تھے۔ سارا دن عائشہ چپ چاپ کمرے میں بیٹھی رہی۔ رات آئی تو کھائے پیئے بغیر چارپائی پر ہی لیٹ گئی۔ نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ کتاب پڑھنے میں اُس کا دل ہی نہیں لگتا تھا۔ اسے بہت افسوس ہوا تھا کہ اُس کی سہیلی کو بھی وقت یاد نہ رہا اور اُس نے غلط کہہ دیا کہ نو بجے لڑکیاں خالدہ ادیب خانم سے ملنے جائیں گی حالانکہ وہ چھ بجے چلی گئی تھیں۔

آدھی رات گزر رہی تھی کہ وہ اونگھنے لگی۔ ایک بار اسے یوں لگا جیسے خواب دیکھ رہی ہے اور اُس خواب میں خالدہ ادیب خانم اُس کے پاس چل کر آ گئی ہے۔

"عائشہ بیٹا"

یہ لفظ سنتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے سامنے دیکھا۔ اُس کی باجی کھڑی اور اُس کی باجی کے ساتھ ایک عورت بھی نظر آ رہی تھی۔ عائشہ ! یہ دیکھو۔ خالدہ ادیب خانم خود تم سے ملنے کے لئے آ گئی ہیں۔ تم اِن سے ملنے کے لئے نہیں گئی تھیں نا۔ عائشہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ کیا سچ مچ خالدہ ادیب خانم اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ آپ سچ مچ خالدہ ادیب خانم ہیں ! عائشہ نے پوچھا' ہاں میری بیٹی ! تم نے مجھے خط لکھا تھا نا۔ میں اُس کا جواب نہ دے سکی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ ایک روز تمہارے گاؤں میں آؤں گی۔ تمہاری استانی سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا معلوم نہیں عائشہ کیوں نہیں آ سکی۔ میں نے سوچا تم بیمار ہوگئی ہو' جی نہیں۔ مجھے صحیح وقت معلوم نہ ہو سکا'۔ عائشہ نے کہا۔ خالدہ ادیب خانم چند منٹ اُس کے پاس رہیں اور جب جانے لگیں تو بولیں" عائشہ بیٹی ! تم نے مجھے ماں لکھا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ مگر اچھی عائشہ ! میری تمہاری اور ہم سب کی ماں یہ زمین ہے، یہ ہمارا وطن ترکی۔ اچھے بچے وہی ہیں جو اپنے وطن کو ماں جان کر اِس سے پیار کرتے ہیں اور جب بڑے ہوتے ہیں تو اِس کی خدمت کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر خالدہ ادیب خانم نے عائشہ کی پیشانی چومی اور چلی گئیں!

عائشہ نے خالدہ ادیب خانم کے کہے ایک ایک لفظ پر عمل کیا۔ وہ خالدہ ادیب خانم کی یہ بات کبھی نہیں بھول سکی کہ اچھے بچے اپنے وطن کو ماں جان کر اُس سے محبت کرتے ہیں اور بڑے ہو کر اُس کی خدمت کرتے ہیں۔

ذیابیطیس کا عالمی دن

دنیا بھر میں ذیابیطیس سے بچاؤ کا عالمی دن 14 نومبر کو منایا جاتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے ثابت کیا ہے کہ ذیابیطیس ایک دائمی بیماری ہے۔ پاکستان میں ذیابیطیس کا مرض بہت تیزی سے پھیل رہا ہے اور موٹاپے کے شکار افراد میں ذیابیطیس کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ذیابیطیس کی علامات میں تھکاوٹ، دُھندلی نظر، پاؤں کا سُن ہوجانا، زخموں کا دیر سے بھرنا، چڑچڑا پن، کمزوری اور بہت زیادہ پیاس، جسمانی وزن میں کمی اور بار بار ٹوائلٹ جانا شامل ہیں۔ حکیم محمد سعید اپنے ایک تحقیقی مضمون میں ذیابیطیس سے بچاؤ اور احتیاط کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ذیابیطیس ایک ایسا مرض ہے جو غذا کے ناقص جذب اور ہضم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اِس میں جسم شکر، نشاستہ اور کاربوہائیڈریٹ کو صحیح طور پر ہضم نہیں کرسکتا۔ یہ شکایت عموماً اُدھیڑ عمر میں فربہ افراد کو ہوتی ہے خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ کبھی کبھی بچے بھی اس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اِس مرض کو موروثی بھی سمجھا جاتا ہے اور شاید اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ بعض خاندانوں میں خاص خاص غذائی روایتیں سختی سے قائم ہوتی ہیں۔ ذیابیطیس کو جڑ سے مکمل طور پر اُکھیڑا نہیں جاسکتا لیکن طبی امداد، پرہیز اور مناسب غذا سے اِس پر پوری طرح قابو پایا جاسکتا ہے اور مریض اپنی طبعی عمر تک ہنسی خوشی جی سکتا ہے۔

اِس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو سادہ ذیابیطیس کہتے ہیں۔ یہ تکلیف دماغ میں واقع غذائنخامی کی خرابی سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس میں پیاس بہت لگتی ہے لیکن شکر کی شکایت نہیں ہوتی۔ اِس کا علاج غذائنخامی کے ہارمون سے تیار کی گئی دوائی سے کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم کو ذیابیطیس شکری کہتے ہیں۔ انسانی لبلبے میں کچھ خلیات ایسے ہوتے ہیں جو انسولین تیار کرنا بند کردیتے ہیں۔ انسولین وہ جزو ہے جو غذا سے حاصل کیے ہوئے نشاستے اور شکر کو ہضم کرتا ہے اور جذب کرتا ہے۔ جب انسولین کم ہوتی ہے تو تمام شکر خون میں شامل ہوجاتی ہے اور جب وہ خون گُردوں میں سے گزرتا ہے تو وہ شکر کو چھان کر پیشاب کے راستے خارج کر دیتے ہیں۔ بدن سے کثرت سے شکر خارج ہونے سے پیاس بہت لگتی ہے۔ بار بار پیشاب آتا ہے۔ اچھا کھانے کے باوجود وزن نہیں بڑھتا۔ بدن کمزور ہوجاتا ہے۔ غنودگی سی طاری ہوجاتی ہے۔ خارش اور پھوڑے سر اٹھاتے ہیں۔ مرض کی شدت میں بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے جس کو کوما کہتے ہیں۔ جب تک لیبارٹری سے خون یا قاروے کا ٹیسٹ نہ کرایا جائے، ذیابیطیس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرض اکثر مخفی رہتا ہے اور زیادہ تکلیف میں جا کر ظاہر ہوتا ہے۔ ذیابیطیس پر قابو پانے کے لیے دو تدبیروں پر ایک ہی وقت میں عمل کرنا ضروری ہے۔ پہلی تدبیر علاج ہے جس کا تعلق معالج سے ہے۔ دوسری تدبیر کا تعلق مریض سے ہے۔ مریض کو چاہیے کہ شکر اور نشاستے والی تمام غذائیوں سے پرہیز کرے اور معالج کے مشورے سے موزوں غذا استعمال کرے۔ یہ تدبیر عارضی نہیں بلکہ عمر بھر کی ہے۔ مریض کو چاہیے کہ مٹھائیاں، بسکٹ، کیک، پیسٹری، حلوہ، فرنی، آئس کریم، بہت شیریں پھل، شربت اور دیگر شیریں مشروبات کو بالکل ترک کر دے۔ اِن کے علاوہ نشاستے اور کاربوہائیڈریٹ والے اناج، سبزیوں اور پھل بھی معالج کے مشورے سے ترک کرنے ضروری ہیں۔ جب حالت نارمل ہوجائے گی تو معالج اناج اور سبزیوں کی حد مقرر کردے گا۔ اِس حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ مشرقی طبی ادویات میں جامن اور کریلے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں غذائیں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ذیابیطیس کے مریضوں میں سرایت (انفیکشن) کے خلاف مدافعت کسی قدر کم ہوجاتی ہے اسی لیے احتیاط برتنی چاہیے۔ پاؤں کا خاص خیال رکھا جائے کہ تنگ جوتے، چوٹ یا زخم سے محفوظ رہیں۔ پورے جسم کی صفائی اور غذاؤں کے معاملے میں پرہیز سے انشاءاللہ طبعی عمر تک پُرمسرت زندگی بسر کی جاسکے گی۔

عالمی یومِ طلبا پر خصوصی سروے
آج کا طالبِ علم اور سوشل میڈیا کا چیلنج

میمونہ شمیل
شعبہ مطبوعات، کراچی

اقوام متحدہ کے تحت سال بھر میں دیگر طبقات کی طرح طلبہ کا دن بھی منایا جاتا ہے۔ 1939ء میں چیکوسلواکیہ پر جرمنی کے قبضے کے دوران چیک طلبہ کا قتل عام کیا گیا۔ 28 اکتوبر 1939ء کو طلبا نے "پراگ" میں سلسلہ وار نازی مخالف مظاہرے کیے تھے۔ چارلس یونیورسٹی کا ایک طالب علم جان اوپلیتل نازی افواج کے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر 11 نومبر کو انتقال کر گیا تھا۔ 15 نومبر کو اوپلیتل کا جنازہ وسیع پیمانے پر نازی مخالف مظاہرے میں تبدیل ہوگیا۔ اُس کے نتیجے میں نازی حکام نے تمام چیک یونیورسٹیز اور کالجز کو بند کر دیا تھا۔ 17 نومبر کو نازیوں نے اعلیٰ تعلیمی اداروں پر چھاپہ مارا۔ نو طلبہ راہنماؤں اور پروفیسرز کو قتل کیا اور 1,200 سے زائد طلبہ کو حراستی کیمپوں میں بھیج دیا تھا۔ بعدازاں اِس واقعہ کے 50 سال مکمل ہونے پر 1989ء میں آزاد طلبہ رہنماؤں نے سوشلسٹ یونین آف یوتھ کے ساتھ مل کر طلبہ کے عالمی دن کی یاد میں ایک بڑے مظاہرے کا اہتمام کیا جو بعد میں پُرتشدد ہوگیا اور فسادات کی صورت اختیار کر گیا۔ اُن کی یاد میں 17 نومبر کا دن عالمی یوم طلبہ کے طور پر منایا جانے لگا۔

اِس دن کا بنیادی مقصد دنیا بھر میں طلبہ کو درپیش چیلنجز اور اُن کے ممکنہ حل کی عملی جدوجہد ہے۔ اسکے علاوہ یہ دن توثیق کرتا ہے کہ طلبہ ہی ملک وملت کے مستقبل کا اثاثہ ہیں۔ یومِ طلبہ کے موقع پر مختلف پروگرامز اور تقریبات کے ذریعے طلبہ میں شعور وآگہی پیدا کی جاتی ہے۔ اِس دن کو منانے کا مقصد طلبہ کو ہر قسم کی معلومات سے باخبر کرنا ہے اور اُن کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کو درست سمت دینا ہے۔ اِس دن طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کیسے نکھار سکتے ہیں اور مثبت رویوں کو کیسے پروان چڑھا سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں طلباء کو بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے۔ اِن میں ایک اہم چیلنج سوشل میڈیا بھی ہے۔ طلباء کی زندگیوں میں مختلف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے باعث اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ طلباء کی روزمرہ کی سرگرمیوں میں سوشل میڈیا کا اہم کردار ہے۔ سوشل میڈیا نے طلبا کو آگے بڑھنے، شخصیت سازی اور کمانے کے بہت سے مواقع فراہم کیے ہیں لیکن اِس کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کے استعمال کے کئی منفی پہلو بھی ہیں۔ اِس سلسلے میں شعبہ مطبوعات کراچی نے ایک سروے کے ذریعے طلبا و طالبات سے سوشل میڈیا کے حوالے سے ایک سروے کیا۔ پوچھا گیا کہ سوشل میڈیا کے مثبت اور منفی پہلو کیا ہیں اور موجودہ دور کے اس چیلنج سے کیسے نمٹا جائے۔

نور قیصر
طالبہ بی بی اے

میرا خیال ہے کہ سوشل میڈیا کے فوائد زیادہ ہیں۔ ہم مختلف پلیٹ فارمز کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ کر کے آن لائن گروپ اسٹڈی کر سکتے ہیں اور تعلیمی سرگرمیوں میں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں۔ یہ بہت حد تک ہماری توجہ اور یکسوئی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ویڈیوز اور ریلز ایک بار دیکھنا شروع کریں تو پھر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کتنا وقت اسی میں گزر گیا۔ ایک دوسرے کی تصاویر اور طرزِ زندگی کو دیکھ کر مقابلہ بازی کے رجحان میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

شہیر کھوسہ
کمپیوٹر سائنس

سوشل میڈیا کے حوالے سے ایک پہلو جس کی میں تعریف کروں گا وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جو خصوصاً کسی تخلیقی کام سے منسلک ہیں، انہیں اس کے اظہار کے لیے بہت سے پلیٹ فارم مل جاتے ہیں۔

شاہ میر خان
اکاؤنٹنگ اینڈ فائنانس

سوشل میڈیا کا طلبا کے لیے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی بھی وجہ سے یونیورسٹی میں کلاسز نہیں ہو رہیں تو ہم سوشل میڈیا کی مختلف ایپس کے ذریعے آن لائن کلاسز لے سکتے ہیں اور قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

ہدی اسلم

شعبۂ ڈیزائن

سوشل میڈیا نے حال ہی میں آرٹیفیشل انٹیلیجنس کو متعارف کرایا ہے اور یہ طلبا کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ وہ اِس کے ذریعے تعلیمی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف چیٹ GPT وغیرہ کی وجہ سے اکثر طالبِ علم خود سے محنت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

واصف وقار

بائیوسائنس

سوشل میڈیا میرے خیال میں تو ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ یہ اینوویشن کو متعارف کراتا ہے۔ جو بھی نیا رجحان (ٹرینڈ) چل رہا ہوتا ہے وہ سامنے آتا ہے۔ آج کی نسل اخبارات اور ٹی وی کے مقابلے میں سوشل میڈیا کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح جو بھی نئی خبر ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتی ہے اور براہ راست معلومات بھی مل رہی ہوتی ہیں۔ طلبا معلومات بھی حاصل کر لیتے ہیں اور اِس کے ساتھ ساتھ مصروفیت سے کچھ وقت نکال کر ہلکی پھلکی تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ چیلنج یہ ہے کہ مختلف کاموں پر توجہ مرکوز کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہر کام ختم کرنے کی جلدی ہوتی ہے تا کہ بس سوشل میڈیا سے جڑ جائیں اور اکثر سوشل میڈیا کے غلط استعمال سے ہی بہت سی افواہیں اور بے بنیاد خبریں بھی پھیل جاتی ہیں اور لوگ بعد میں اُن کی تردید کر رہے ہوتے ہیں۔

عائشہ ذیشان

طالبہ پی ایچ ڈی

سوشل میڈیا کی یلغار نے درحقیقت ہمیں اپنی بہت سی روایات اور تہذیب سے دور کر دیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ سوشل میڈیا کے فوائد کے مقابلے میں اس کے منفی اثرات زیادہ ہیں۔ اِس وقت سوشل میڈیا کے حوالے سے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ نوجوانوں کی سوشل میڈیا میں بڑھتی ہوئی دلچسپی اور اِس کا استعمال انہیں اُن کی مذہبی اور اخلاقی روایات سے دور تو نہیں کر دے گا۔ اِس سلسلے میں رائے عامہ تشکیل دینے والے ادارے اور افراد کا کردار بہت اہم ہے کہ وہ پائیدار ترقی کے لیے سوشل میڈیا کے مثبت استعمال کے اقدامات وضع کریں۔

اریج فاطمہ

بی ایس سوشل ورک

نوجوانوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ سوشل میڈیا طلبہ کو اپنے دوستوں، اساتذہ اور دیگر لوگوں سے جڑنے کا موقع دیتا ہے جس سے معلومات کا فوری اور آسان تبادلہ ممکن بن جاتا ہے۔ مختلف خیالات اور نظریات پر بحث کے ذریعے نوجوان تنقیدی سوچ کی مہارتیں ترقی دے سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر مختلف سماجی مسائل پر آگاہی بڑھانے کا مواقع ملتے ہیں۔ طلبہ اور نوجوان سوشل میڈیا پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکتے ہیں جیسے کہ لکھائی، آرٹ اور ویڈیو بنانے کی مہارتیں۔

اِن چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے تعلیم، کھل کر بات چیت اور نوجوانوں میں صحت مند سوشل میڈیا عادات کو فروغ دینا ضروری ہے۔ تا کہ دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے طلبہ ایک دوسرے کے خیالات، نظریات، مفادات اور مشکلات کے حوالے سے آگاہی حاصل کر سکیں، اور ایک متفقہ بیانیہ اور سوچ کے ساتھ ترقی کے سفر پر گامزن ہو سکیں۔

موضع بلی ٹنگ

(تاریخ کے تناظر میں)

تحریر: احمد پراچہ

کوہاٹ شہر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر راولپنڈی روڈ پر ایک کلومیٹر پر دائیں جانب بلند پہاڑوں میں گھرا ہوا موضع بلی ٹنگ واقع ہے۔ اِس کے مشرقی جانب گھنڈیالی، گھنڈیالی پایاں، تولنج گھنڈیالی اور گمبٹ کے دیہات واقع ہیں جبکہ اِس کے مغربی جانب مواضع خرماتو، بھوراگڑھی اور ڈھوڈہ شریف جبکہ جنوب میں موضع کوٹ اور موضع سیاب واقع ہیں۔

بلی ٹنگ کی وجہ تسمیہ کی تاریخ محض سینہ بہ سینہ روایات پر مبنی ہے۔ اِس کا قدیم نام "دروازئی'' تھا جبکہ بلی ٹنگ کو تاریخ میں (بیاللوتنگے) کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ایک قدیم روایت کے مطابق خوشحال خان خٹک نے اِس مقام پر جنگ ہاری تھی اور انہوں نے اِس مقام کو "بیاللوتنگے" کا نام دیا لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ماضی میں یہ سرسبز خطہ تھا۔ حکومتِ انگلشیہ کے دور میں انگریز اسے بلیوٹاؤن (BLUE TOWN) بھی کہتے تھے لیکن اُس زمانے میں چونکہ تعلیم نہ تھی اَن پڑھ لوگوں نے بلیوٹاؤن کے بجائے بلی ٹنگ کہنا شروع کر دیا اور غلط الکلام کے استعمال کے باعث اِس کا نام بلی ٹنگ پڑ گیا۔

رقبہ کے لحاظ سے بلی ٹنگ گیارہ مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق بلی ٹنگ کی آبادی پچیس ہزار لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہاں جو سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں وہ نقد آور ہیں۔ ماضی میں آبپاشی کے لئے یہاں کنوؤں پر رہٹ اور ہنڈولے لگائے جاتے تھے لیکن اب ٹیوب ویل اور تاندہ ڈیم سے نکالی گئی نہر سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ آبنوشی کے لئے گھروں میں کنوؤں اور پبلک ہیلتھ کے ٹیوب ویل کی سہولت موجود ہے۔

یہاں کی دکانیں اور رہائشی مکانات کسی ترتیب اور نقشوں کے مطابق نہیں بنے۔ یہ قدیم روایتی طرزِ تعمیر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ گلی محلوں کے راستے عام طور پر کچے ہیں۔ حجروں کی روایت ابھی باقی ہے لیکن اکثر لوگ اپنے مہمانوں کو اپنی بیٹھک میں ٹھہراتے ہیں۔

ہر علاقے کی کوئی نہ کوئی وجہ شہرت ہوتی ہے۔ بلی ٹنگ کی وجۂ شہرت مزری کی منڈی اور مزری کی صنعت ہے۔ بلی ٹنگ میں مزری منڈی تقسیم سے قبل قائم ہو چکی تھی جس کی بنیاد 1935ء میں ملک محمد اکبر خان مرحوم آف بابری بانڈہ نے رکھی تھی۔

انگریزوں نے اس صنعت کے فروغ کے لئے بابری بانڈہ کے مقام پر ریلوے اسٹیشن قائم کیا تھا۔ بلی ٹنگ میں مزری اور اِس سے بنی ہوئی اشیاء لانے لے جانے کا سب سے اہم ذریعہ ریل گاڑی سے خام مال مزری، بلی ٹنگ لانے کے لئے بابری بانڈہ ریلوے اسٹیشن پر اُتارا جاتا ہے اور پھر منڈی میں پہنچایا جاتا ہے۔ یہ تجارتی منڈی اپنی انفرادیت 1945ء سے برقرار رکھے ہوئے ہے۔

بلی ٹنگ میں جب مقامی سطح پر مزری کی فصل کی پیداوار گھٹتے گھٹتے گھٹ گئی تو مزری کو دیگر شہروں رزمک، بنوں، ڈیرہ جات اور صوبہ بلوچستان کے علاقوں سے منگوانا شروع کر دیا گیا مگر انگلشیہ دورِ حکومت میں کوہاٹ کے اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر شیخ محبوب علی نے مزری ایکٹ نافذ کر کے مزری کی درآمد پر پابندی کر دی اور اِس صنعت کو محکمہ جنگلات کے زیرِ نگرانی کر دیا گیا۔ 1947ء سے قبل کوہاٹ میں جب مسٹر لاوس نامی انگریز ڈپٹی کمشنر تعینات ہوا تو اُس نے نہ صرف مزری پر عائد پابندی اُٹھا دی بلکہ پرمٹ سسٹم کو متعارف کرایا۔

مسٹر لاوس نے مزری کی گھریلو صنعت پر خصوصی توجہ دی اور اِس صنعت سے منسلک افراد کو معاشی استحکام دینے کے لئے ایک سوسائٹی کا نام دی وکڑی کوآپٹیو مزری منڈی لمیٹڈ بلی ٹنگ رکھا اور اسے اگست 1945ء میں رجسٹرڈ کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر لاوس خود اِس کے اعزازی صدر بنے۔ یہ سوسائٹی 1945ء سے آج تک قائم ہے اور اُسے کوہاٹ کی قدیم سوسائٹی کا اعزاز حاصل ہے۔

بلی ٹنگ کی 75 فیصد آبادی مزری سے متعلق مصنوعات کی تیاری سے وابستہ ہے۔ کوہاٹ کی پہچان اگرچہ کئی چیزوں کی وجہ سے ہے تاہم بلی ٹنگ کی مزری کی صنعت بھی اِس کی وجۂ شہرت کا ایک حوالہ ہے۔

ریڈیو پاکستان کوہاٹ

خطۂ ملتان کو جسے اولیاء کرام کی دھرتی کہا جاتا ہے 21 نومبر 1970ء بمطابق 20 رمضان المبارک 1390ھ صبح 00-10 بجے ریڈیو پاکستان ملتان کی صورت میں اپنی آواز ملی۔ ریڈیو پاکستان ملتان کے پہلے اناؤنسر اور پرائڈ آف پرفارمنس سید قیصر نقوی کی آواز میں ہوا کے دوش پر جب یہ اعلان ہوا ''یہ ریڈیو پاکستان ملتان ہے'' جس کا افتتاح اُس وقت کے وزیر برائے اطلاعات ونشریات نوابزادہ شیر علی خان نے کیا۔

ریڈیو پاکستان ملتان سرائیکی وسیب کا پہلا ریڈیو اسٹیشن ہے کہ جس نے نہ صرف قومی مشاہیر اور ملکی حکام کے افکار و نظریات، فرامین و بیانات، تقاریر و پیغامات اور حالاتِ حاضرہ کی معلومات ہر فرد تک پہنچائیں بلکہ سننے والوں کی تفریح وطبع کیلئے ریڈیائی ڈرامے، طنز و مزاح پر مبنی خاکے، مشاعرے، مباحثے، گیت اور غزلیں، علمی و ادبی مذاکرے اور دیگر کئی رنگارنگ پروگرام اپنی نشریات کے آغاز کے ساتھ ہی شروع کیئے جس میں شخصی و روحانی تربیت کیلئے مذہبی پروگرام بھی شامل تھے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔

ریڈیو پاکستان ملتان نشریات کا آغاز دراصل سرائیکی خطے کے فنکاروں کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر تھی۔ دیگر ذرائع ابلاغ کی تیزی سے ہوتی ہوئی ترقی بھی ریڈیو کی اہمیت کو کم نہ کرسکی۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ ریڈیو کی مٹی بڑی ہی زرخیز ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس نے بھی ایک بار اِس میں قدم رکھا وہ اناؤنسر ہو یا پروڈیوسر، ڈرامہ آرٹسٹ ہو یا کوئی لکھاری اُس کا پھر اِدھر سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا میں پھر کہیں بھی چلا جائے کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو جائے لیکن ریڈیو کی محبت کو خود سے کبھی الگ نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو کے شعبے سے جو لوگ بھی خلوص نیت سے وابستہ ہوئے یا رہے اُن کے نام ریڈیو پاکستان ملتان کی تاریخ کا آج بھی حصہ ہیں۔ جناب شمس الدین بٹ (تمغۂ قائداعظم) آپ ریڈیو پاکستان ملتان کے پہلے اسٹیشن ڈائریکٹر رہے جو ریڈیو کی گاڑی رواں رواں ہی تھل دمان کے گوشے گوشے تک لے گئے اور خطۂ ملتان کے مختلف صداکاروں کے ساتھ ساتھ لوک فنکاروں کی بھی ایک بڑی تعداد کو مائیکروفون تک لائے۔ خطۂ ملتان کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کے علمی و ادبی کاموں کو اُجاگر کرنے میں بھی بے شمار درخشاں ستارے ریڈیو پاکستان کی پروڈکشن ٹیم کا حصہ رہے۔

جب رات کی تاریکی چھٹتی ہے اور صبح کی روشنی ظاہر ہونے لگتی ہے تو ریڈیو پاکستان سے قومی نشریاتی رابطے پر ہر روز اِک صدا اُبھرتی ہے ''حی علی الفلاح (آؤ کامیابی کی طرف)''۔ کامیابی کا راستہ دکھانے والی یہ صدا صبح کے آغاز کو اور بھی خوب تر کر دیتی ہے اور سننے والوں کی روحانی تسکین بھی کرتی ہے۔ انہی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے مذہبی پروگراموں کا اہتمام ریڈیو پاکستان ملتان کی شاندار روایات کا خاصہ ہے۔

ریڈیو پاکستان ملتان کے ادبی منظرنامے کی بات کریں تو اِس میں بہت سے ایسے معروف نام سامنے آتے ہیں کہ جنہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ حسین سحر، مقبول عباس کاشر، نوشابہ نرگس، ثمر بانو ہاشمی، اختر حسین جعفری، نصرت مند خان، منور شہزاد، عامر فہیم، اسلم انصاری، عاصی کرنالی، اصغر ندیم سید، مسعود اشعر، ڈاکٹر عرش صدیقی، حمید رضا صدیقی، انور جمال، اقبال ارشد، پروفیسر شوکت مغل، اشو لعل، رفعت عباس، ممتاز اطہر، احمد خان طارق مقبول حسن گیلانی، رشید قیصرانی، حسن رضا گردیزی، عزیز شاہد، ڈاکٹر مہر عبدالحق، حفیظ خان، محسن نقوی، خالد سعید، شاکر حسین شاکر، شمیم حیدر ترمذی، رضی الدین رضی، سجاد حیدر، ڈاکٹر انوار احمد، طاہر تونسوی اور ایسے ہی دیگر کئی نام شامل رہے۔

جب کبھی ریڈیو پاکستان سے قومی نشریاتی رابطے پر ریڈیائی ڈرامے پیش کئے

جاتے ہیں سننے والا ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے، صداکاروں کے چہرے سامنے نہیں ہوتے لیکن اُن کا انداز و آواز ایسا تاثر قائم کرتا ہے کہ انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ بھی اسی نشریاتی دنیا کا حصہ ہے۔ ریڈیو پاکستان ملتان کی ریڈیائی ڈرامے کی تاریخ بھی بہت درخشاں ہے۔ 25 دسمبر 1970ء کو پروڈیوسر سعید مرزا نے یہاں سے نشریات کے ایک ماہ بعد ہی پہلا ڈرامہ پیش کیا تھا جس کا نام 'شبِ مراد' تھا جس میں قیصر نقوی، فرخ مراد، ڈاکٹر افتخار احمد عفت ذکی اور نشاط پروین جیسے ستارے شامل تھے۔ روبینہ ناز، زاہد سلیم، شاہد سلیم، تسنیم بھٹی، عظمیٰ گیلانی، تسنیم سہیل امتیاز تاج، خالدہ نسیم، طارق علوی، تسنیم محبوب، خالد ملک سہیل اصغر، محسن گیلانی، منیر حسین شامی، نصرت ہاشمی اور زاہد خان جیسے معروف صداکار اِس نشریاتی سفر میں ریڈیو پاکستان ملتان کے ہمسفر رہے اور بعد میں ہزاروں صداکار اِس کا حصہ بنے۔ زاہد خان صوتی اثرات کے حوالے سے ریڈیو پاکستان ملتان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔ جشنِ تمثیل کے عنوان کے تحت بھی ریڈیو پاکستان ملتان سے جو ریڈیائی ڈرامے پیش کئے گئے یقیناً وہ یہاں کے صداکاروں، لکھاریوں اور پروڈیوسرز کی اعلیٰ پیشہ وارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ریڈیو پاکستان ملتان کی تاریخ ''سوجھل سویل، کرن اُجالا، سرود سحر، لنچ بریک، پاسبان، پرائم ٹائم، وسدے لوک، اتم کھیتی اور جمہور دی آواز'' جیسے پروگرامز کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ ملک عزیز الرحمٰن، شمشیر حیدر ہاشمی، عبدالرحمٰن، سید قمر حسین نے اپنے انداز و محنت سے جس طرح براڈکاسٹنگ کی دنیا میں اپنی یادیں باوقار انداز میں چھوڑیں یہ ہر نئے سیکھنے والے اور ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہر اُس شخص کے لئے اثاثہ ہیں جس کا دعویٰ ہے کہ اسے ریڈیو پاکستان سے حقیقتاً محبت ہے۔ نصر اللہ خان ناصر، زاہدہ صدیق، اختر حسین جعفری، جیسے براڈکاسٹرز نے بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوایا۔ سید طارق شاہ اور علی تنہا جیسے براڈکاسٹرز بھی یقیناً ریڈیائی دنیا میں باصلاحیت فنکاروں کو آواز دی۔

نئی طرزِ نشریات 1987ء میں جب شروع ہوئیں تو پہلی بار ریڈیو پاکستان ملتان کو بہترین ریڈیو اسٹیشن کا ایوارڈ ملا۔ 1993ء اور 2001ء میں ریڈیو پاکستان ملتان نے تین [illegible] ایوارڈز نام کیے۔ 2005ء ریڈیو میوزک فیسٹول میں دو ایوارڈز اور ملک عزیز الرحمٰن کے تیار کردہ پروگرام ''میوزک اِن ملتان'' جس کو پروفیسر اسلم انصاری نے تحریر کیا۔ اِس منفرد پروگرام کے حوالے سے بھی ریڈیو ملتان قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہترین اسٹیشن کا حق دار قرار پایا۔

ریڈیو پاکستان سے ہمارے گلوکار اُردو موسیقی کے ساتھ ساتھ سرائیکی موسیقی کے رنگوں کو بھی اپنی خوبصورت آواز سے مہکا رہے ہیں۔ اِن میں پٹھانے خان، ناہید اختر، اقبال بانو، فوزیہ خانم، ثریا ملتانیکر، اُستاد حسین بخش ڈاہڈی، عارف خان بابر، شفاعت حسین، شہزادہ آصف علی، سلیم گردیزی، نعیم الحسن، [illegible]، اعجاز راہی، نسیم اختر، شبیر ملک، نگینہ نرگس، امبر آفتاب، ثوبیہ ملک، ساجد ملتانی، روزینہ مشرف، ثمر منیر، نادیہ ہاشمی، [illegible] فاروقی ان گلوکاروں کے گیت سننے والوں کی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ اِس کے علاوہ بلوچی بھائیوں کی آواز بنتے ہوئے ریڈیو پاکستان ملتان سے ''روش'' پروگرام بھی شروع کیا گیا جس میں بلوچی میوزک بھی ہوتا ہے اور معلومات بھی۔

ریڈیو پاکستان ملتان وہ میڈیم ہے جو سننے والوں کی ضروریات، سماجی اقدار اور نظریات کو سامنے رکھ کر اپنے پروگرامز ترتیب دیتا ہے۔ ریڈیو پاکستان نے جدید منفرد طریقوں سے اپنے اور سامعین کے درمیان ایک مضبوط تعلق بنایا ہے اس کی ایک عملی مثال سیلاب کے دنوں میں بھی ہمیں نظر آئی۔ جب مسائل میں گھرے لوگوں کی ریڈیو پاکستان ملتان آواز بن گیا۔ راجن پور، تونسہ، ڈی جی خان میں سیلاب متاثرین کے مسائل و مشکلات کے حوالے سے خصوصی پروگرامز کا اہتمام کر کے ریڈیو پاکستان ملتان نے یہ ثابت کیا کہ دُکھ کی اِس گھڑی میں ایک غمگسار دوست کی طرح ریڈیو پاکستان ملتان اپنے سیلاب متاثرین کے ساتھ ہے اور امداد و بحالی کے تمام تر مراحل کی تکمیل تک ریڈیو پاکستان ملتان اپنے سیلاب متاثرین کی آواز بنا رہے گا۔

اِس وقت ریڈیو پاکستان ملتان ملک کا جدید ترین اسٹیشن بن چکا ہے۔ نئے ڈیجیٹل ٹرانسمیٹر فریکوئنسی 1035 کلو ہرٹز کے ساتھ پہلے سے زیادہ طاقت ور آواز رکھتا ہے۔ اِس کے دو چینل ایف ایم 101 اور ایف ایم 93 بھی اپنے پروگرامز کے حوالے سے جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ اسی طرح ملک میں کرونا کی وبا کے دوران ریڈیو پاکستان ملتان نے اپنی نشریاتی ذمہ داری کو احسن انداز میں پورا کرتے ہوئے قومی نشریاتی رابطے پر بھی اپنے حصے کے پروگرامز کو پیش کیا۔

موجودہ اسٹیشن ڈائریکٹر سہیل سرور الٰہی نے اپنے پیغام میں کہا کہ ریڈیو پاکستان ملتان اپنے سامعین کی اُمنگوں کا ترجمان ہے اور ہم اپنے سامعین کی پسند اور روایات کی قدر کرتے ہوئے جدید طرزِ نشریات کی بنیادوں پر مزید بہتر سے بہتر پروگرامز کو اپنی ٹرانسمیشن کا حصہ بنائیں گے۔

☆......☆......☆

بروز پیر، منگل 21 تا 22 اکتوبر پاک چائنہ سینٹر میں شماریاتی سربراہ (Chief Statistician) ڈاکٹر نعیم الظفر (ستارۂ امتیاز) کی سربراہی میں Datafest 2024 کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستان بھر سے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے سرکاری، نیم سرکاری کے علاوہ نجی اداروں اور بین الاقوامی ادارے جو اعداد و شمار پر گہری نظر رکھتے ہیں، نے اپنے اسٹالز لگائے اور اُن میں ریڈیو پاکستان کو خاص کوریج کرنے کا بھی موقع ملا۔ ڈائریکٹر انجینئرنگ محمد عاقل خان، ڈپٹی کنٹرولر انجینئرنگ محمد عقیل، انجینئرنگ منیجر محمد کاشف، ڈپٹی کنٹرولر سیلز اُجالا خورشید اور FM101 کی ٹیم جن میں پروگرام منیجر صدف رانی، سینئر پروڈیوسر عمران منور اعوان، ناصر علی خان اور آر جیز اور افشاں نگار (مدیرہ آہنگ) نے خصوصی شرکت کر کے Datafest 2024 میں موجود مختلف شخصیات کے انٹرویوز کیے اور Datafest 2024 کی بھرپور کوریج کی۔ Datafest کے اختتام پر ممبر (سپورٹ سروسز اریسوس مینجمنٹ) محمد سرور گوندل (ستارۂ امتیاز) نے ریڈیو پاکستان کی کامیاب کوریج پر شیلڈ پیش کی جسے راقم الحروف نے وصول کیا۔

اسلم پرویز

''پاکستانی فلمی دنیا کا ہیرو بھی اور ولن بھی''

آہنگ ڈیسک

اسلم پرویز (12 فروری 1932ء - 21 نومبر 1984ء) پاکستانی فلمی اداکار تھے۔ اسلم پرویز کا اصل نام ضیاء تھا۔ اُن کی فلمی زندگی کا آغاز 1955ء میں انور کمال پاشا کی فلم ''قاتل'' سے ہوا تھا۔ یہ اداکارہ نیئر سلطانہ کی بھی پہلی فلم تھی۔ اسلم پرویز نے اپنے کیریئر کے ابتدائی دور میں ''پاٹے خان، پردیسن، چھومنتر، کوئل اور نیند'' جیسی فلموں میں ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ بطور ہیرو کام کیا۔ انھوں نے 1966ء میں بطور ولن اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا اور فلم ''پھنے خان'' میں نور جہاں کے ساتھ بطور ہیرو کردار ادا کیا۔ 1950ء میں پاکستانی فلمی صنعت کو اسلم پرویز کی شکل میں ایک مقبول ہیرو ہی نہیں کامیاب ولن بھی ملا جس نے ہر روپ میں بے مثال اداکاری کی اور اُن کی فلموں کو شائقین میں زبردست پزیرائی حاصل ہوئی۔ اسلم پرویز نے اپنے فنی سفر کا آغاز فلم ''قاتل'' سے کیا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک مہذب اور باوقار شخص اپنی منفرد حرکتوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے تمام فلم کے ہیرو اور ہیروئن کی زندگی کو فلم کے اختتام تک اجیرن بنائے رکھتا ہے۔ پاکستانی فلمی دنیا کی چوٹی کا یہ ولن اپنے ابتدائی دور میں پاکستان کا تیسرا کامیاب ترین فلمی ہیرو بھی تھا۔ اسلم پرویز نے ایک ایسے وقت میں فلمی دنیا پر بطور ہیرو راج کیا تھا جب پاکستان کی فلمی تاریخ کے بڑے بڑے نام یعنی سنتوش اور سدھیر جیسے کامیاب ہیروز کے مقابلے میں اسلم پرویز بالکل نئے تھے۔ اُنہیں اداکار درپن، اکمل، اعجاز، حبیب اور کمال کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

ابتدا میں وہ فلموں میں مرکزی کردار ادا کرتے تھے جن میں ''پاٹے خان، پردیس، پینگاں، پاسبان، مس 56، چن ماہی، آنکھ کا نشہ، چھومنتر اور کوئل'' جیسی فلموں کے نام سرفہرست ہیں۔ بعد ازاں وہ فلموں میں ولن کا کردار ادا کرنے لگے۔ اُن کی ایسی فلموں میں فلم سہیلی، انسان اور آدمی، رواج، بہارو پھول برساؤ، شکوہ، دامن اور بہن بھائی کے نام خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

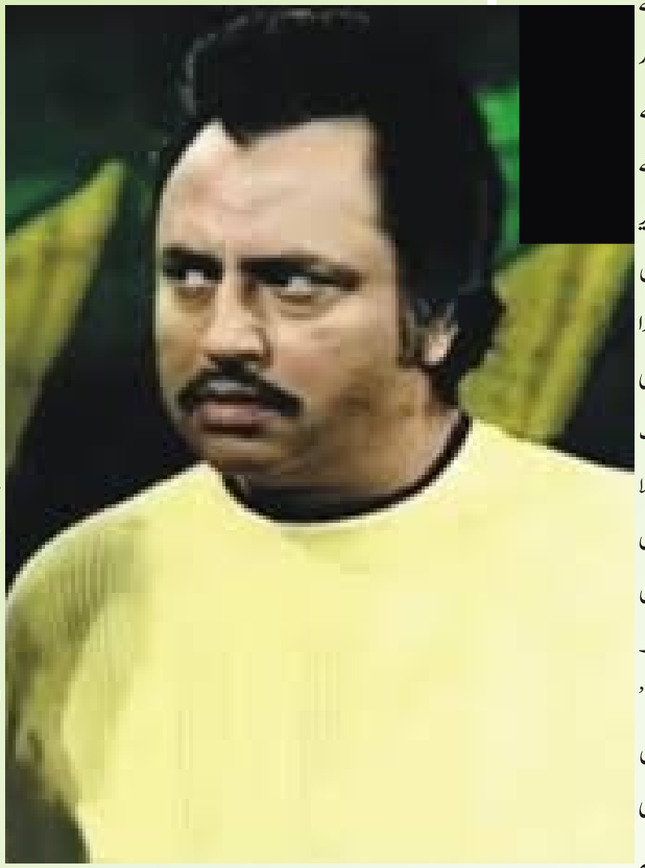

14 نومبر 1984ء کو اسلم پرویز اداکار اقبال حسن کے ساتھ ہدایت کار حیدر چوہدری کی فلم ''جھورا'' کی عکس بندی کے بعد فیروز پور روڈ، لاہور سے اپنے گھر واپس جا رہے تھے کہ اُن کی کار کا ایک ویگن سے تصادم ہو گیا۔ اِس تصادم کے نتیجے میں اقبال حسن جائے حادثہ پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ اسلم پرویز ایک ہفتہ تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔